صرف احباب جماعت کی تعلیم و تربیت کے لیے

انٹرنیشنل

پیغامِ صُلح

مدیر: مدثر عزیز

قیمت فی پرچہ -/5 یورو

فون: +49-308735703

Email: generalsecretaryaaiil@gmail.com

احمدیہ انجمن لاہور (جرمنی) کی خصوصیات

- آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، نہ نیا نہ پرانا۔
- قرآن کریم کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں نہ آئندہ ہوگی۔
- سب صحابہ اور آئمہ قابل احترام ہیں۔
- سب مجددوں کا ماننا ضروری ہے۔
- کوئی کلمہ گو کافر نہیں۔

جلد نمبر 01	30 محرم تا 29 صفر 1438 ہجری یکم نومبر تا 30 نومبر 2016ء	شمارہ نمبر 15

حضرت اقدس مجدد صد چہاردہم کی طرف سے نذرانہ محبت

دَرْرہِ عشقِ محمدؐ

شانِ احمد را کہ داند جُز خدا وند کریم
احمدؐ کی شان کو سوائے خداوند کریم کے کون جان سکتا ہے

آنچناں از خود جُدا شد کزمیاں اُفتادمیم
وہ اپنی خودی سے اس طرح الگ ہوگیا کہ میم درمیان سے گرگیا

زاں نمط شد محوِرِ دلبر کز کمالِ اتحاد
وہ اپنے معشوق میں اِس طرح محو ہوگیا کہ کمال اتحاد کیوجہ سے

پیکرِ اُوشد سراسر صُورت ربِّ رحیم
اس کی صورت بالکل ربِ رحیم کی صورت بن گئی

بُوئے محبوبِ حقیقی میدمد زاں روئے پاک
محبوبِ حقیقی کی خوشبو اُس کے چہرے سے آرہی ہے

ذاتِ حقانی صفاتش مظہرِ ذاتِ قدیم
اُس کی حقانی ذات خُدائے قدیم کی ذات کا مظہر ہے

گرچہ منسوبم کندکس سوئے الحاد و ضلال
خواہ مجھے کوئی الحاد اور گمراہی سے ہی منسوب کرے

چُوں دل احمد نمے بینم و گر عرشِ عظیم
مگر میں تو احمدؐ کے دل جیسا اور کوئی عظیم الشان عرش نہیں دیکھتا

منت ایزد را کہ من بر رغمِ اہلِ روزگار
خدا کا شکر ہے کہ میں دنیاداروں کے برخلاف۔

صد بلاہا میخرم از ذوقِ آں عین النعیم
اس چشمہ نعمت کی خواہش کیوجہ سے سینکڑوں دُکھ خریدتا ہوں

از عنایات خُدا وز فضلِ آں دادارِ پاک
خدا کی مہربانیوں اور اس ذات اقدس کے فضل و کرم سے

دشمنِ فرعونیانم بہر عشق آں کلیم!
میں بھی اس کلیم کی محبت کی خاطر فرعونی لوگوں کا دشمن ہوں

آں مقام و رتبتِ خاصش کہ برمن شد عیاں
ان کا وہ خاص مقام اور مرتبہ جو مجھ پر ظاہر ہوا

گفتمے گر دیدمے طبعے دریں راہِ سلیم
میں اس کا ضرور ذکر کرتا اگر اس راہ میں کوئی سلیم فطرت والا پاتا

در رہِ عشقِ محمدؐ ایں سر و جانم رود
محمدؐ کے عشق میں میرا سر اور جان قربان ہو

این تمنا ایں دُعا ایں در دِلم عزمِ صمیم
یہی میری خواہش ہے یہی میری دُعا ہے اور یہی میرے دل میں پختہ ارادہ ہے

اداریہ

محمد مصطفیٰؐ ہر فضل و کمال کا منبع

حکیم الامت علامہ اقبال نے خوب کہا تھا

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست

گر بہ او نہ رسیدی تمام بو ہبی است

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شخصیت کو جامع الصفات بنایا اور تمام تر نعمتیں آپؐ کو عطا فرمائیں۔ تمام انبیاء کرام کے کمالات آپؐ کو عطا فرمائے۔ اور بلاشبہ صبرِ ایوب، خلّتِ ابراہیمؑ، حسنِ یوسفؑ، جلالِ موسیٰؑ اور جمالِ عیسیٰؑ سیرتِ مصطفویؐ میں ملتے ہیں۔ سارے کمالات اور حسن جو انبیائے کرام کی سیرتوں میں نظر آتے ہیں وہ سب آپؐ کی ذاتِ اقدس میں یک جا کر دیئے گئے۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اسی لئے ختمِ نبوت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ تمام نعمتیں اور ہر فضل و کمال آپؐ پر ختم ہے۔

اپنے آقا و مولیٰ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد فرماتے ہیں:

ختم شد بر نفس پاکش ہر کمال

لاجرم شد ختم ہر پیغمبرے

اب قیامت تک کسی کو جو کچھ بھی ملے گا وہ نبی کریم ﷺ کے واسطہ سے ملے گا۔ چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان ہے:

ترجمہ: ''میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔'' (بخاری شریف کتاب العلم)

آپؐ ہر فضل و کمال کا منبع ہیں۔ جو شخص آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع کے بغیر خدا کا قرب حاصل کرنے کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔ اب قربِ الٰہی کے تمام راستے اتباعِ نبویؐ سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں۔

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں۔

''کوئی مرتبہ شرف و کمال کا اور کوئی مقام عزت اور قرب کا بجز سچی اور کامل متابعت اپنے نبی کریم ﷺ کے ہم ہرگز حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ ہمیں جو کچھ ملتا ہے ظلی اور طفیلی طور پر ملتا ہے۔ (ازالہ اوہام)

جو لوگ اتباعِ نبویؐ اور محبتِ مصطفویؐ کے ذریعہ فنا فی الرسولؐ کے مقام پر پہنچتے ہیں وہ انبیاء کرام کے رنگ میں رنگین ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ اور احمدؐ کہتے ہیں اور کبھی انا الرسول اور انا النبی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ایسے لوگ فی الواقع نبی اور رسول نہیں ہوتے بلکہ زمرۂ اولیاء کے ہی فرد رہتے ہیں سرورِ کائنات خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت میں ایسے بے شمار برگزیدہ اولیاء اور امام ہوئے اور اُن سے کبھی کوئی زمانہ خالی نہیں رہا۔

حضرت امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جو شخص صورتِ محمدیہ میں متحقق ہوتا ہے اس کو یا محمدؐ اور صورتِ موسویہ میں اس کو یا موسیٰ اور جو صورتِ عیسویہ میں اس کو یا عیسیٰ کہا جاتا ہے۔

(طبقات الاولیاء ص ۴۸۶)

یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق حکیم الامت علامہ اقبالؒ کہتے ہیں

ماہنوز اندر ظلام کائنات او شریک اہتمام کائنات

او کلیمؑ او مسیحؑ او خلیلؑ او محمدؐ او کتاب او جبریلؑ

اس تمام تفصیل سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تمام فضائل کا سرچشمہ ہیں۔ آپؐ تمام نعمتوں کا نقطہ کمال ہیں اب جو کچھ کسی کو ملے گا وہ آپؐ کی غلامی اور آپؐ کے ذریعہ سے ملے گا۔ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ترجمہ: ''کہہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ تم سے محبت کرے اور تمہیں تمہارے گناہ بخش دے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے'' (آل عمران)

زندگی کا رُخ متعین کرنے کیلئے بزرگوں کے حالات سے آگاہی ضروری ہے

اختتامی خطاب و دُعا، فرمودہ حضرت امیر ڈاکٹر عبدالکریم سعید پاشا ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

برموقع تقریب ''یادرفتگان'' مورخہ 05-11-2016

یادرفتگان کا سلسلہ کچھ سالوں سے جاری ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس سال بھی یہ دوسری تقریب بسلسلہ یادرفتگان آج منعقد ہورہی ہے۔ میں اس پروگرام کو بہت اہمیت دیتا ہوں کیونکہ یہ ہمارے بزرگوں کے حالات زندگی اور ان کی سلسلہ کے لئے خدمت وقربانی ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ ہے۔ جو قومیں اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہیں تاریخ بھی ان کو بھلا دیا کرتی ہے۔ ہر بزرگ اپنے خاندان کے لئے اہم ہوتا ہے اور اس کے رشتہ دار اس پر فخر کرتے ہیں لیکن ہماری جماعت کی بزرگ ہستیاں ہر احمدی کے لئے قابل فخر نمونہ ہیں۔ اپنے بزرگوں کے نمونہ سے آگاہی ہمیں ان کے نقش قدم کی نشاندہی کرتی ہے او رہمیں اس پر چلنے کے لئے ایک رُخ ملتا ہے۔

آج جب قاضی عبدالاحد صاحب کے متعلق قاری ارشد صاحب کو کچھ کہنے کو کہا گیا تو مجھے فکر لاحق ہوئی کہ وہ کیا بولیں گے وہ تو ان کے اس وقت سے نہیں واقف جب سے ہم ان کو جانتے تھے لیکن انہوں نے حالات کو خوب بیان کیا۔ یہاں سعید اللہ بھی موجود ہے جس نے ان سے بہت علم اخذ کیا اور وہ بڑے فخر سے کہتے تھے کہ سعید اللہ فلاں آیت نکال کر دکھاؤ اور کہتے تھے کہ اس کو میں نے یوں سکھادیا ہے کہ یہ دو منٹ میں نہیں بلکہ ایک منٹ میں آپ کو حوالہ نکال کر دکھا دے گا۔

قاضی صاحب علم کے خزانے پر سانپ بن کر نہ بیٹھتے تھے بلکہ آپ دونوں ہاتھوں سے اپنا خزانہ بانٹتے تھے۔ ان کے شاگرد ان سے فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کا بار بار ذکر کیا کرتے تھے کہ یہ بہت ہی ہونہار طالب علم ہیں اور خاص کر فائزہ عثمان جو کہ عامر عزیز کی بہن ہیں ان کی ہمیشہ تعریف کرتے تھے کہ فائزہ جیسے سیکھ گئی ہے اور کسی نے نہیں سیکھا۔ سارہ سعادت کا بھی ذکر کیا کرتے تھے، میرے پیچھے بھی پڑے رہتے تھے لیکن میں ان کے طریقے سے متفق نہیں تھا وہ کہتے تھے کہ انگلیوں پر گن کر بتاؤ کہ فلاں انگلی پر کیا آتا ہے تو میں ان کو کہتا تھا کہ اگر آئمہ مجھے پڑھا دیں یہ انگلیاں مجھ سے نہیں پڑھی جاتیں۔

ان کی ایک چیز جو مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے وہ یہ تھی کہ انہوں نے قرآن حفظ کرنا 76 سال کی عمر میں شروع کیا، انہوں نے قرآن حفظ کرنے میں میری بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور کہتے تھے ابھی آپ پورا پھل نہیں کھا سکے۔ آپ سب دعا کریں کہ میں بھی یہ پھل کھا سکوں۔ آپ اپنے قرآن حفظ کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب (امیر جماعت) نماز پڑھاتے ہوئے کہیں کہیں رک جاتے ہیں تو مجھے بہت شرم آتی ہے۔ تو پہلے انہوں نے تمام وہ سورتیں جو حضرت امیر کو یاد تھیں وہ سب یاد کیں کہ پیچھے سے وہ لقمہ دے سکیں او رپھر اس کو بڑھاتے بڑھاتے تمام قرآن حفظ کرلیا۔ قاضی عبدالاحد صاحب کے بارے میں ایک بات جو بتانی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کمال کا حافظہ دیا ہوا تھا کہ آپ نے 76 سال کی عمر میں حفظ کرنا شروع کیا اور چار سال میں وہ پھل کھالیا۔ انہوں نے حفظ کے بعد تراویح باقاعدہ سے باوجود عمر رسیدہ ہونے کے پڑھائیں۔

سائنس سے ثابت ہے کہ دماغ میں حساب، موسیقی وغیرہ کے اپنے اپنے مرکز ہیں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو یاد کرنے کا بھی ایک علیحدہ مرکز رکھا ہوا ہے۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم بھی اسے استعمال کرسکیں۔ آمین

ان کے حافظ کی مثال یہ بھی ہے کہ وہ فضل الباری کے بھی حافظ تھے۔ آپ نے پیغام صلح میں شائع ہونے والے خطبات اور مضامین کی فہرست بھی تیار کی۔

ارشد علوی صاحب نے اپنے والد محترم جناب اعظم علوی مرحوم کے متعلق حالات بیان کئے۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ سالوں میں ان کے والد کے حالات بیان کئے اور میری طرف منسوب کر کے کہا کہ ''میرے دل میں ایک تشنگی رہ گئی''۔ میں نے ہی اُن سے کہا تھا کہ علوی صاحب مرحوم کو میں باقی بزرگوں کی طرح قریب سے نہیں جانتا تھا کیونکہ میری زندگی زیادہ تر ایبٹ آباد میں گزری اور کچھ بارہ تیرہ سال بیرون ممالک میں جہاں سے لوٹ کر پھر ایبٹ آباد میں گزری تو وہ ایسی شخصیت ہے جو میری زندگی میں نہیں آئیں۔ ان کو بس ایک حوالے سے جانتا ہوں کہ وہ بلند پایا کے شاعر تھے، دل سے لکھتے تھے اور جماعت کی ترجمانی کرتے تھے، ہر ایک کے درد میں ان کو درد محسوس ہوتا تھا اور وہ اس درد کا اظہار اشعار میں فرماتے تھے۔ چونکہ میں بھی شاعری کرتا ہوں میں ان کی شاعر ہونے کے ناطے بہت عزت و قدر کرتا ہوں، ارشد علوی صاحب ایک عظیم والد کا بیٹا ہونے کا حق ادا کررہے ہیں۔ وہ سلسلہ کی تصنیفات میں اہم کردار ادا کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر سے نوازتا رہتا ہے اور وہ جوان کے اندر بزرگی حضرت باہوؒ کی طرف سے آتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کی دین کے ساتھ جو لگن ہے وہ ورثہ میں ملا ہے۔ ان کو میں چلتا پھرتا معجزہ سمجھتا ہوں۔ یہ آپ سب کی دعاؤں سے باوجود 35% دل کاٹ دینے کے بعد بھی آج زندہ ہیں اور جماعت کا کام کررہے ہیں اس لئے اللہ نے ان کی زندگی بڑھائی ہے۔ ان کی زندگی دعاؤں کی قبولیت اور زندہ خدا کا دعاؤں کا سننا ثابت کرتی ہے۔

محترمہ صفیہ سعید صاحبہ نے پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کے حالات زندگی بیان فرمائے۔ پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب ایسی شخصیت تھے جن کو ہم اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔ ہمیں اس وقت کبھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ یہ شخصیت ہماری خونی رشتہ میں شامل نہیں، ہم ان کو ہمیشہ اپنی امی کا بھائی سمجھتے تھے اور ان کو خلیل پاجی کہتے تھے، وہ سب کے استاد تھے۔ میری بڑی بہن عائشہ آپا سے لے کر سب سے چھوٹے زاہد تک اور پھر ان کی اولادوں کے بھی، اور جب میں نے میڈیکل کالج میں کام شروع کیا تو اس وقت کے سٹاف پروفیسر، اسسٹنٹ پروفیسر اور پرنسپل ان میں سے کم از کم دس بارہ ایسے تھے جو پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کے پڑھائے ہوئے تھے کیونکہ وہ زوالوجی کے ایبٹ آباد میں پروفیسر تھے آپ کی بڑی عزت تھی اور جب آپ آخری بیماری میں داخل ہوئے جو ان کی جتنی خدمت کرسکتا تھا وہ کررہا تھا، اور کبھی انہوں نے اس کو جتایا نہیں جیسے ابھی میری بہن نے کہا کہ وہ بے لوث پڑھاتے تھے، اور موسم کی گرمی سردی، بارش برف باری کی پرواہ کئے بغیر وہ روزانہ چار بجے ہمارے گھر پہنچ جاتے اور چھ بجے تک پڑھاتے رہتے۔ آپ کا گھر ہمارے گھر سے آدھ میل دور واقعہ تھا، ہر مضمون کو وہ پڑھاتے تھے، جب میں نے 1956ء میں ایک سال کے لئے فرنچ پڑھی تو وہ کہتے تھے کہ ''سارے مضمون مجھ سے پڑھ لو لیکن فرنچ مجھ سے باتیں نہیں کرتی''، اور ایسے ایسے شارٹ کٹ حساب میں سکھاتے تھے کہ ہمارے استاد کو شک ہوتا تھا کہ ہم نے گھر میں استاد لگایا ہوا ہے کیونکہ ہمارے سکول میں ٹیوشن لگانی سختی سے منع تھی۔ باقی بچے ابھی جواب لکھ رہے ہوتے تھے اور ہمیں جواب آجاتا تھا۔ زوالوجی ان کا مضمون تھا لیکن پھر بھی وہ ہر مضمون پڑھاتے تھے۔ اب میں بہت آگے نہیں جاؤں گا۔ تفصیلاً آپ کی زندگی کے حالات میری بہن صفیہ سعید صاحبہ نے سنا دیئے ہیں۔ میں ایک ذاتی تجربہ سنا کر تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ اس واقعہ میں ان کی عزت کی جھلک نمایاں ہے جو

ہمارے خاندان میں پروفیسر صاحب کی تھی۔

میری سالگرہ تھی تو میری امی کہہ رہی تھیں آج میرے بچے کی آٹھویں سالگرہ ہے اوراس دوران میں نے ایک دم کہا کہ ''بوبوجی خلیل بھی بلایا ہے کہ نہیں بلایا'' تو ایک زوردار تھپڑ مجھے اپنی سالگرہ کے دن لگا اور وہ اس لئے لگا کہ اپنے استاد اور بزرگ ہستی کی تم عزت نہیں کرتے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ماں باپ نے ایک محترم استاد کا احترام عملاً سکھایا وہ دن بزرگوں اور اساتذہ کی عزت کرنے کا دن تھا۔ آج کل ہم بڑوں کی کیا عزت کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے وہ ہم اپنے تئیں سوچ سکتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ زندگی میں جو ایک تھپڑ کھایا ہوا ہے وہ پروفیسر خلیل احمد صاحب کی وجہ سے کھایا اور ان کی عزت ہمیشہ کے لئے میرے دل میں ماں کے ہاتھوں سے رقم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت نصیب کرے اور ان سب کے نقش قدم پر چلنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ آمین

یہاں پر بہت سے احباب بیٹھے ہیں میں سب سے پھر کہوں گا کہ ہمیں بیٹھ کر میٹنگ کرنی پڑتی ہے کہ کن بزرگوں پر بولا جائے لیکن آپ کے لئے یہ فخر کی بات ہونی چاہیے کہ آپ ازخود اپنے بزرگوں کے حالات بیان کرنے کے شوق کا اظہار کریں۔

آخر میں علوی صاحب کو کہنا ہے کہ یادرفتگان کا جلسہ سال میں دو مرتبہ ہوتا ہے وہ ان تقاریر کو قلم بند کر کے چھپوائیں۔ اگلی دس جلدوں کا میٹریل ہمارے پاس ہے، اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ یہ اگلے سال کچھ ہمیں ایک دو اور جلدیں مہیا کردیں۔

آئیں سب مل کر دعا کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نہ صرف ان تین بزرگوں کو جن کے متعلق ہم نے سنا بلکہ ان تمام بزرگوں کو جو ہماری جماعت کے ہیں اور آج ہم میں نہیں ہیں ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے اچھے اچھے نمونہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور جو ہم سنتے ہیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہماری کمزوریاں درگزر کردے۔ آمین

مبارک نبی

وہ انسان جو سب سے زیادہ کامل اور انسانِ کامل تھا اور کامل نبی تھا اور کامل برکتوں کے ساتھ آیا جس سے روحانی بعث اور حشر کی وجہ سے دنیا کی پہلی قیامت ظاہر ہوئی اور ایک عالم کا عالم مرا ہوا اس کے آنے سے زندہ ہوگیا وہ مبارک نبی حضرت خاتم الانبیاء امام الاصفیاء ختم المرسلین فخر النبیین جناب محمد مصطفیٰ صلعم ہیں اے پیارے خدا اس پیارے نبی پر وہ رحمت اور درود بھیج جو ابتداء دنیا سے تو نے کسی پر نہ بھیجا ہو اگر یہ عظیم الشان نبی دنیا میں نہ آتا تو پھر جس قدر چھوٹے چھوٹے نبی دنیا میں آئے جیسا کہ یونسؑ اور ایوبؑ اور مسیحؑ بن مریم اور ملاکیؑ اور یحییٰؑ اور ذکریاؑ وغیرہ ان کی سچائی پر ہمارے پاس کوئی بھی دلیل نہیں اگرچہ سب مقرب اور وجیہہ اور خدا تعالیٰ کے پیارے تھے یہ اسی نبی کا احسان ہے کہ یہ لوگ بھی دنیا میں سچے سمجھے گئے۔ اللھم صلی وسلم و بارک علیہ و الہ و اصحابہ اجمعین و اخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین. (اتمام الحجۃ، ص ۲۸)

☆☆☆

سورۃ فاتحہ کی دُعا تقاضائے فطرت ہے

ڈاکٹر بشارت احمد مرحوم و مغفور

سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے۔ اس میں خدا کو مخاطب کر کے انسان کو دعا کرنا سکھایا گیا ہے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین میں جمع متکلم کا صیغہ انسان کے لئے ہی ہے۔ اس دعا میں انسان کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ وہ کس طرح جناب الٰہی کو مخاطب کر کے دُعا کرے۔ یہ کس قدر جناب الٰہی کی غریب نوازی اور بندہٗ پروری ہے کہ انسان کو دُعا کا طریق خود ہی سکھا دیا۔ آپ کا کیا یہ مطلب ہے کہ خدا صرف حکم ہی دیا کرے اور بندہٗ کو کچھ نہ سکھائے۔ اگر جناب الٰہی میں دُعا کرنا ایک بڑی ضروری چیز ہے تو یہی وہ کڑی ہے جو بندہٗ کو خدا سے جوڑتی ہے تو سب سے پہلے کیا یہ ضروری نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو دعا اور اس کے طریق و آداب سکھاتا۔ قرآن تو ایک ایسی کتاب ہے جو بندہٗ کو ہر ایک قسم کی ہدایت کی تعلیم دیتی ہے۔ دعا جیسی اہم چیز اور خدا جیسی وراء الورا ہستی، انسان تو قطعاً نا قابل تھا کہ وہ اس عالی شان ہستی کے حضور میں عرض کرنے کے آداب جانتا۔ یہاں دنیا کے معمولی بادشاہوں اور حاکموں کے دربار میں عرض مدعا کرنے کے خاص طریق اور آداب ہوتے ہیں تا کہ ایک ناواقف انسان عرض مدعا کرتے وقت اپنی لاعلمی کی وجہ سے آدابِ شاہی کو نظر انداز نہ کر دے۔ اور کوئی ایسی غلطی نہ کر بیٹھے جو تعظیم اور صحیح خطاب کے مخالف ہو تو جناب باری احکم الحاکمین کے دربار میں بندہٗ ہیچمدان جب کچھ عرض کرنے کے لئے کھڑا ہو تو کیا یہ ضروری نہیں کہ اس سرکار عالی کو صحیح طور پر خطاب کرنے اور اپنے عرض مدعا کرنے کے آداب اسے سکھائے جائیں۔ اسی غرض کو سورۃ فاتحہ کے ذریعہ پورا کیا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دی گئی ہے کہ کن صفات اور تعریف کے ساتھ جناب باری کو مخاطب کیا جائے اور اس سرکار عالی سے اپنا تعلق کیا اور کس طرح جتایا جائے اور وہ کیا اہم مدعا ہے جسے اس آستانہ الوہیت پر پیش کرنے کے لئے بندہٗ کو بار بار اس چوکھٹ پر گرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن اور سورۃ فاتحہ

پس سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ نے سکھائی اور یہ دعا بھی وہ دعا ہے جس کے بغیر نہ تو مقصد تخلیق انسانی حاصل ہو سکتا ہے اور نہ وحی الٰہی کی ضرورت ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی لئے اس کو قرآن کے شروع کرنے سے قبل رکھا گیا۔ گویا اس سے بتانا یہ مقصود تھا کہ قرآن کا نزول اسی دعا کی قبولیت کا نتیجہ ہے۔ یعنی اگر اس دعا کا وجود نہ ہوتا تو قرآن ہی نازل نہ ہوتا۔

میرا مطلب اس طرح زیادہ واضح ہو سکتا ہے کہ پہلے آپ دعا کو سمجھ لیں کہ دعا کیا چیز ہے۔

دعا کیا چیز ہے؟

دعا فطرت صحیحہ کا ایک تقاضاء لابد ہے۔ ہر ایک انسان بچہ سے لے کر بوڑھے تک اور غریب سے لے کر امیر تک اور جاہل سے لے کر عالم تک اپنے علم یا طاقت کی کوتاہی پر اپنے سے زیادہ علم یا طاقت رکھنے والے سے استمداد کرتا ہے۔ یہی اصل دعا کی بنیاد ہے اور یہ ایک فطرت ہے جس سے کوئی فرد بشر خالی نہیں۔ ایک بچہ جب کسی بوجھل چیز کو اُٹھا نہیں سکتا تو رو کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا ہے یعنی باپ سے استمداد کرتا ہے۔ باپ اس کی طاقت کی کمی کو دیکھ کر اسے وہ چیز اٹھا دیتا ہے۔ اسی طرح بچہ بار بار مختلف چیزوں کی نسبت اپنے باپ سے سوال کرتا رہتا ہے اور باپ اپنے علم سے اس کے علم کی کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک بیمار جب اپنے مرض کی تشخیص نہیں کر سکتا تو وہ ڈاکٹر سے استمداد کرتا ہے یعنی اپنی کمی علم کی تلافی اپنے سے زیادہ علم ولاے سے کرانا چاہتا

ہے۔ایک شخص اگر ایک بوجھ کو خود نہیں اُٹھا سکتا تو وہ اپنے سے زیادہ طاقتور شخص سے استمداد کرتا ہے۔ایک شخص اگر خود اپنی طاقت سے دشمن کے مقابل میں اپنی حفاظت نہیں کرسکتا تو وہ پولیس یا حاکم وقت سے جو اس سے بڑھ کر طاقت رکھتے ہیں استمداد کرتا ہے۔اس طرح جب ایک عقلمند انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ باوجود ڈاکٹر سے استمداد کرنے کے اس کی دوائیں اس کے اوزار اس کا علم سب ایک حد تک مرض پر اثر ڈالتے ہیں اور اس سے آگے قدرت کے قوانین کے سامنے کچھ زور نہیں چلتا۔کیونکہ نہ اس کا علم دقیقہ قدرت پر حاوی ہے۔نہ ہر ایک باریک در باریک اور مخفی در مخفی اسباب پر اسے قدرت حاصل ہے۔تو وہ اس قادرِ مطلق اور عالم کل کے آستانہ پر استمداد کے لئے گرتا ہے جس کا علم ہر چیز پر حاوی اور جس کی قدرت ہر بات پر حکومت کرتی ہے۔اسی طرح جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ حالات ایسے جمع ہیں کہ نہ پولیس اس کی کچھ مدد کرسکتی ہے نہ حاکم ہی کچھ بنا سکتا ہے تو وہ پھر اس احکم الحاکمین سے استمداد کرتا ہے جس کی حکومت ذرہ ذرہ پر محیط ہے۔

فطرت کا تقاضائے لابد

غرض کہ دعا فطرت کا تقاضائے لابد ہے۔کون انسان ہے جو اپنی کمی علم یا طاقت کی کوتاہی کو دیکھ کر اپنے سے بڑھ کر صاحب علم اور صاحب قدرت ہستی کی طرف رجوع نہیں کرتا فرق صرف دور بینی اور معرفت کا ہے۔مادہ پرست انسان کی استمداد مادی چیزوں تک ہی محدود رہ جاتی ہے اور ایک عارف کی استمداد اس سے آگے بڑھ کر خدا تک پہنچ جاتی ہے بلکہ وہ شروع سے ہی اس سبب الاسباب اور قادر مطلق سے ہی استمداد کرتا ہے اور اسباب دنیوی کو اس کی طرف سے سمجھتا ہے اور اُن سے کام لینے میں درحقیقت وہ اس وقت اس فضل کو تلاش کرتا ہے جس کا اصل منبع جناب الٰہی ہے گویا جن اسباب سے وہ کام لیتا ہے درحقیقت انہیں وہ ایک دروازہ سمجھتا ہے۔جس راہ سے فضل ربی کو آنا ہے بس اس کی استمداد محض جناب باری سے ہوتی ہے نہ کہ کسی اسباب دنیوی سے۔وہ اسباب دنیوی کو محض ایک خادم کی صورت سے دیکھتا ہے۔وہ بیمار ہوتا ہے تو اپنے رب سے شفاء کی درخواست کرتا ہے اور پھر ایک ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے کہ شاید وہ فضل جو میں نے اپنے رب سے مانگا تھا اسی راہ سے آتا ہو اسے ایک ظالم ستاتا ہے تو وہ اپنے رب سے پناہ مانگتا ہے اور پھر ایک حاکم کے دروازہ کو کھٹکھٹاتا ہے کہ شاید وہ پناہ اور امن جو جناب الٰہی سے مانگا تھا اس کے آنے کا دروازہ یہی ہو۔پس جناب باری سے یہی استمداد دعا کہلاتی ہے جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کرسکتا۔

حصول خلافت الٰہی کا رستہ

انسان جس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا تھا یعنی خلافت الٰہی۔اس کا حصول دنیا کی پیچیدگیوں اور نیرنگیوں میں کوئی آسان کام نہ تھا۔قدم قدم پر ٹھوکر اور لغزش کا خطرہ اور ہر پیچ پر مختلف راہیں تھیں۔انسان حیران تھا کہ کدھر جائے اور کونسی راہ اختیار کرے جس سے مورد انعام الٰہی اور خلافت کا وارث ہو اور ہلاکت اور تنزل اور ذلت وضلالت سے بچ جائے۔اس کوتاہی اور کمی طاقت کا فطرتی تقاضا تھا کہ انسان جناب الٰہی سے استمداد و اطانت کرتا کہ اسے صراط مستقیم بتائی جائے جس پر چل کر وہ اپنے مقصد تخلیق کو حاصل کر سکے لیکن غفلت کے پردے اس قدر زبردست اور خواہشات کی بھول بھلیاں اس قدر دلچسپ تھیں کہ ایک عامی محجوب انسان سے خود اپنی فطرت اپنی نگاہ سے مخفی ہوگئی تھی۔وہ بھول ہی گیا تھا کہ میں کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔مگر ایسے قلوب صافی تھے جنہوں نے اس کمی علم اور کوتاہی طاقت کو محسوس کر کے آستانہ الوہیت پر اس خشوع وخضوع اور تضرع وزاری سے صراط مستقیم کے لئے ہدایت طلب کی مشیت الٰہی نے اپنے علم کامل سے انسانی علم ناقص کی کمی کو پورا کیا اور ان کے قلب پر وحی کے ذریعہ علم الٰہی کا نزول فرمایا۔اس طرح ان قلوب صافی رکھنے والے کاملین زمانہ نے خدا سے اس صراط مستقیم کو پا کر جس پر چل کر تخلیق انسانی کا مقصد پورا ہوتا اور انسان خلافتِ الٰہی کا وارث ٹھہرتا ہے،نوع انسان کو اس کی طرف ہدایت کی۔ان پاک اور مطہر انسانوں میں سب سے بڑھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح تھی۔جس کی تضرع وزاری اور استمداد واستعانت نے

جناب باری سے قرآن جیسا مکمل ہدایت نامہ پایا۔ جس نے صراط مستقیم کو اس طرح واضح اور روشن کیا کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہ تھا۔

فاتحہ کو شروع میں رکھنے کی غرض

پس جب قرآن کا نزول دعائے فطرت انسانی کے تقاضا پر تھا تو ضرور تھا کہ قرآن شروع کرنے سے قبل اس دعا کو رکھا جاتا وہ اس بات پر حجت ہوئی کہ وحی کا نزول انسان کے تقاضائے فطرت کو پورا کرنے کے لئے ہے یعنی انسان کی فطرت اپنی کوتاہی علم اور کمی طاقت کو محسوس کر کے جو خدا سے صراط مستقیم کا صحیح علم اور کامیابی کی طاقت چاہتی تھی، اس تقاضا کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل فرمایا ہے۔ چنانچہ اس سے سورۃ فاتحہ کے بعد ہی جب قرآن شروع ہوتا ہے۔ تو ان آیات سے شروع ہوتا ہے کہ ’’یعنی اے انسان جو صراط مستقیم کی ہدایت کا طلبگار ہے میں اللہ کامل علم رکھنے والا اپنے علم سے تجھے خبر دیتا ہوں کہ یہ کتاب وہ ہے جو بلا شک وشبہ تقویٰ کی راہ اختیار کرنے والوں کے لئے مکمل ہدایت نامہ ہے۔‘‘ پس جس ہدایت کا تو طلبگار ہے وہ اس کتاب کے ذریعہ تجھے عطا کی گئی۔

الغرض سورۃ الفاتحہ کو قرآن کے شروع میں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ تا وحی کے نزول کی ضرورت واضح ہو اور بتایا جائے کہ قرآن فطرت انسانی کے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے آیا ہے اور اس طرح پر ایک انسانی فطرت کو اس کی خواب غفلت سے جگایا جائے اور اس کو اپنا مقصد پیدائش یاد دلایا جائے تا کہ اُن میں سے ہر ایک اس دعا کے ذریعہ سے خدا سے صراط مستقیم کا صحیح علم اور اس پر چلنے کی توفیق مانگے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کریم کا جو عین صراط مستقیم سے صحیح علم اور اس پر عمل کی توفیق جناب الٰہی سے مانگتا رہے اور اس طرح مقصد زندگی کو پالے۔

دعائے فاتحہ کا خدا کی طرف سے سکھایا جانا ضروری تھا

پس سورۃ فاتحہ ہی وہ دعائے فطرت انسانی ہے جس کے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے قرآن کریم کا نزول ہوا۔ اور یہی وہ دعا ہے جس کے کرنے سے انسان صراط مستقیم کا صحیح علم اور اس پر عمل کرنے کی قوت اپنے اندر پاتا ہے۔ کیا ضروری نہ تھا کہ ایسی اہم دعا اللہ تعالیٰ خود انسان کو سب سے پہلے سکھاتا اگرچہ یہ دعا اس کی فطرت کے اندر موکوز تھی مگر وہ اپنی کمی معرفت کی وجہ سے جناب الٰہی کو مخاطب کرنے کے آداب سے ناواقف تھا۔ اپنی عبودیت کے راز سے ناآشنا تھا۔ اس کو تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کسی عظیم الشان مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ پس کیا ضروری نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفاتِ کاملہ کا ایک مجمل اور صحیح مرقع اس کے آگے پیش کرتا۔ جس سے متاثر ہو کر اس کی روح حمد کرتی ہوئی آستانہ الوہیت پر گر کر اپنی عبودیت کا اقرار کرتی۔ اور جس اعلیٰ مقصد کے لئے اس کو پیدا کیا گیا تھا اس کا علم ہو جانے پر اس کے لئے صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت اور عنایت کی طلبگار ہوتی۔

دعا میں التزام

چنانچہ اسی امر کا سورۃ فاتحہ میں التزام کیا گیا اور انسان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کو رکھ کر اسے حمد وثناء کی اور اپنے اقرار عبودیت کرنے کی تعلیم دی اور اس کے بعد اس صراط مستقیم پر چلنے کی قوت مانگنا سکھایا جس پر چل کر انسان اپنے مقصد تخلیق کو حاصل کر کے وارث خلافتِ الٰہی ٹھہرتا ہے۔

دعائے فاتحہ حکایتاً عن الانسان ہے

پس سورۃ فاتحہ میں اس دعا کو وحی کے ذریعہ حکایتاً عن الانسان سکھایا گیا ہے جس کی ضرورت ہر انسان کو ہے اور جس کے بغیر اس کا مقصد پیدائش ہی فوت ہو جاتا ہے۔ پس ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اس دعا کو سکھاتا ورنہ اس کا وحی کے ذریعہ انسان کو ہدایت دینا بلا دلیل اور خواہ مخواہ دخل در معقولات ٹھہرتا اور ایک غافل انسان اپنے مقصد زندگی کو حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے ایک سمجھدار انسان اس کو پڑھتے ہی سمجھ لیتا ہے کہ یہ ایک عظیم الشان دعا ہے جو انسان کو تعلیم کی گئی ہے اور یہ دیکھ کر خدا کی حمد سے اس کا دل لبریز ہو جاتا ہے

کہ جناب الٰہی نے اپنے بے انتہا رحم اور فضل سے دعا کرنے کا بھی طریق بندہ کو خود سکھایا۔لیکن اللہ نے جو علیم وحکیم ہے اتنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اندر انسان کو امر کے رنگ میں حکم بھی دیا ہے کہ اے انسان تو اس دعا کو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ پڑھا کر جس سے آپ کا سارا اعتراض ہبأ منثورا ہو جاتا ہے کیونکہ درحقیقت انسان کو پہلے جناب الٰہی نے مخاطب کیا ہے اور پھر اس نے یہ دعا پڑھوائی ہے گویا پڑھ انسان رہا ہے اور پڑھا اللہ تعالیٰ رہا ہے۔

بسم اللہ میں فعل محذوف

یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ سورۃ فاتحہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے شروع ہوتی ہے جس کے لفظی معنی ہیں ''ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن اور رحیم ہے'' میں یہاں بسم اللہ کی تفسیر نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں کوئی فعل نہیں۔آخر کوئی فعل محذوف ماننا پڑے گا۔وہ کیا فعل محذوف ہے۔اسے خود قرآن نے ہی بتا دیا ہے۔سب سے پہلی قرآنی وحی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ ہے ''اقرا باسم ربک الذی خلق'' جس کے معنی ہیں ''تو پڑھ ساتھ نام اپنے رب کے جس نے تجھے پیدا کیا'' گویا انسان کو جب قرآن پڑھانا شروع کیا تو اس کو حکم دیا کہ ''تو اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھ'' بس اب قرآن میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے سورۃ کو شروع کرے گا وہاں اقرا محذوف ماننا پڑے گا۔اور اس کے معنی ہمیشہ ہوں گے ''تو پڑھ ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن اور رحیم ہے'' اسی طرح سورۃ فاتحہ شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' فرما کر انسان کو حکم دیا کہ ہم تیرے معلم بن کر تجھے کچھ پڑھانے لگے ہیں پس اے انسان تو پڑھ ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔پھر جو کچھ پڑھنا تھا یعنی دعا فاتحہ وہ کمال شفقت ورحمت سے انسان کو خود پڑھایا اور تعلیم دی۔گویا صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا بندہ معلم اور متعلم بنے ہوئے ہیں۔ایک پڑھا رہا ہے دوسرا پڑھ رہا ہے۔

فصاحت کلام

یہاں ایک لطیفہ اور بھی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آیت میں اقرا کے لفظ کو محذوف کرنے میں جناب الٰہی کے مدنظر نہ صرف فصاحت تھی بلکہ اپنے کمال عنایت سے یہ بھی یہ منظور خاطر تھا کہ انسان اس اعلیٰ درجہ کی فصیح وبلیغ آیت سے دعا کے رنگ میں بھی نفع اٹھائے اگر اقراء کا لفظ محذوف نہ ہوتا تو اول تو یہ فقرہ بھدا ہوتا جو فصاحت کلام کے خلاف ہے اور دوم اس کے معنی صرف ایک ہی پہلو پر محدود ہو جاتے۔یعنی ہمیشہ یہی معنی ہوتے کہ تو پڑھ ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔مگر پھر پڑھنے والا انسان جب پڑھتا تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہے بے معنی ہوتا کیونکہ وہ آگے کس کو کہتا کہ تو پڑھ۔وہ تو خود پڑھ رہا ہے۔پس اقراء کا لفظ محذوف کر کے اس میں یہ خوبی پیدا کر دی کہ وحی کے نزول کے وقت اللہ تعالیٰ انسان کو پڑھاتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ تو پڑھ ساتھ نام اللہ کے لیکن پڑھنے کے وقت انسان جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہے تو اقراء کی تعمیل ارشاد میں اقراء کا فعل محذوف مان کر مفہوم یوں لیتا ہے کہ میں پڑھتا ہوں ساتھ نام اللہ کے۔گویا آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں معلم اور متعلم دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے حسب منشاء مفہوم کو لیتے ہیں۔معلم جب پڑھاتا ہے تو اقرا محذوف ہوتا ہے وہ کہتا ہے تو اس کا اپنا پڑھنے کا فعل اسی آیت میں بجائے اقرا کے اقراء کو محذوف کر کے یوں مفہوم پیدا کرتا ہے کہ ''میں پڑھتا ہوں ساتھ نام اللہ کے'' بس جہاں وحی نزول کے وقت اس آیت میں پڑھنے کے لئے ہے وہاں پڑھنے والے کے لئے اسی آیت میں پڑھتے وقت جناب الٰہی سے استعانت اور مدد کی ہے۔اور یہ خوبی اقرا کے فعل کو محذوف کرنے سے حاصل ہوئی۔

☆☆☆☆

انگریزی سے ترجمہ: اطہر رسول

امیر جماعت سوئم، ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب مرحوم ومغفور

ہمارے شفیق رہنما اور ایک درخشندہ مثال

از ڈاکٹر زاہد عزیز، انگلستان

''جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا''

(القرآن ۱۷:۵۷)

اس خراج تحسین کے لئے میں نے مذکورہ بالا آیت کریمہ کا انتخاب اس بناء پر مناسب خیال کیا ہے کیونکہ ہمارے دور میں مرحوم حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے ذریعہ ہی تحریک احمدیہ، لاہور میں ایک نئی روح پیدا ہوئی اور جماعت کو اپنی کارکردگی، فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک دفعہ پھر ادراک ہوا۔

جب ہم ڈاکٹر سعید احمد خاں صاحب مرحوم کے بارے میں اپنی یادوں اور مشاہدات پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ امر قطعی طور پر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس نوعیت کے مواد پر مبنی مضمون میں مضمون نگار سے متعلق کئی ایک ذاتی حوالہ جات کا ذکر بھی آ جاتا ہے اور اس ذکر میں محض مرحوم کے ایک شاہد، شکر گذار اور احسان مند ہونے کے ناطے سے تاثرات اور واقعات کا بیان فطری امر ہے۔ اس مضمون کا حقیقی مقصد مرحوم حضرت امیر کی عظیم الشان خوبیوں، کردار اور کارناموں پر روشنی ڈالنا ہے۔

یہ امر میرے لئے نہایت تکلیف دہ ہے کہ میں مرحوم حضرت امیر صاحب کے بارے میں ذاتی تاثرات قلمبند کروں کیونکہ تحریر کا یہ عمل مجھے آپ کی وفات کی حقیقت کا سامنا کرنے اور اسے قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس موقع پر صرف انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ میری تسکین کا باعث بنتے ہیں۔ جب بھی حضرت امیر مرحوم کے کسی عزیز کی وفات پر ہم ان سے تعزیت کرتے تو آپ بے مثال صبر اور خدا کی رضا کے سامنے سر جھکانے کا مظاہرہ کرتے اور ہمیں بھی خدا کے لکھے کو قبول کرنے کی تلقین فرماتے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۵ء کے موسم گرما میں آپ کے دورہ انگلستان کے دوران میں ہوئی۔ یہ دورہ ان دورہ جات میں سے ایک تھا جو آپ نے جماعت احمدیہ، لاہور کو پاکستان سے باہر قائم کرنے اور مستقل بنیادوں پر استوار کرنے کی غرض سے کئے۔ آپ کا نام ہمارے خاندان میں نہ صرف آپ کی جماعت کے ساتھ طویل مدت کی وابستگی اور ممتاز حیثیت کی بناء پر جانا جاتا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ آپ نے میری رشتے کی دادی جان کا ۱۹۴۴ء میں پھیپڑوں کا علاج کیا تھا جب وہ آپ کے زیر اہتمام معروف ڈاڈر ٹی بی سینیٹوریم میں زیر علاج تھیں۔

۱۹۷۵ء میں مذکورہ ملاقات کے بعد اگلے ۲۱ برس تک مجھے اپنے کام کے سلسلے میں آپ کی دانشمندانہ راہنمائی، مشوروں اور حوصلہ افزائی سے مستفید ہونے کا خصوصی امتیاز اور سعادت حاصل رہی۔

تحریک کے لئے کئے گئے اس کام کی توفیق کے لئے میں ہمیشہ اللہ کا شکر گذار ہوں گا۔ ہر کسی کو کام کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آپ کے ماتحت نہیں ساتھ کام کر رہا ہو۔ کیونکہ آپ کا ہر فرد کے ساتھ سلوک دوستانہ اور مساویانہ ہوتا تھا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب ۱۹۷۴ء کے موسم گرما میں احمدیوں کے خلاف پر تشدد ہنگاموں کے بعد

حکومت پاکستان نے احمدیوں کو اپنی تاریخ کے شدید ترین دھچکے سے دوچار کر دیا تھا۔ ہمارے احباب کو پاکستان کے مذہبی راہنماؤں کی جانب سے تحریک احمدیہ کا ساتھ نہ چھوڑنے کی صورت میں جان و مال کے نقصان اور معاشرتی مقاطعہ کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ فطری طور پر ہم سب جماعت کے مستقبل کے بارے میں اندیشوں، غیر یقینی اور شکوک وشبہات کا شکار تھے۔ ان حالات میں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی جانب سے سچائی کے نصب العین کے حصول اور تمام مشکلات اور خطرات کا ذاتی طور پر مضبوط کردار اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرنے سے ہمیں نہ صرف بے پناہ تقویت حاصل ہوئی بلکہ تحریک پر ہمارا ایمان مزید پختہ ہو گیا۔

انہی دنوں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اگر اللہ نے اس جماعت کے خاتمے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر ہم اسے بچانے کے لئے جو کچھ چاہیں کر لیں ہم اسے نہیں بچا سکتے۔ مگر میرا خیال نہیں ہے کہ اللہ نے اس جماعت کے خاتمے کا ارادہ کیا ہے۔'' بالفاظ دیگر اگر اللہ اس جماعت کی بقاء چاہتا ہے تو اس جماعت کو کوئی طاقت بھی کچل نہیں سکتی۔ بعد کے حالات نے یہ بات بالکل سچ ثابت کر دی کہ اللہ نے اس جماعت کو محفوظ رکھا، اس کی آڑے وقت میں مدد کی اور اسے تقویت پہنچائی۔ وہ افراد جو کہ اس جماعت کے خاتمے کے لئے سرگرداں تھے خود اللہ کے ہاتھوں صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور وہ مطلبی احباب جنہوں نے اس تحریک کو آزمائش کی گھڑی میں خیر باد کہہ دیا تھا، بالاخر مایوسی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ کر پائے۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء تک آپ نے ۸۱ اور ۸۳ کے علاوہ ہر برس انگلستان کا دورہ کیا اور وہاں کئی ہفتے قیام کیا۔ آپ نے ۱۹۸۶ء میں بھی وہاں جانے کا ارادہ کیا مگر یہ دورہ دل کی تکلیف کی بناء پر منسوخ کرنا پڑا۔ انگلستان سے آپ دیگر ممالک میں موجود شاخوں کا دورہ کیا کرتے تھے جن میں ہالینڈ، جزائر غرب الہند، سرینام، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی شامل ہیں۔ انگلستان میں آپ جماعت کے ارکان سے ملاقات کے لئے لندن سے باہر بریڈفورڈ اور مانچسٹر تک سفر کیا کرتے تھے۔ آپ نے یہ تمام تھکا دینے والی مسافتیں اس وقت طے کیں جب آپ ۷۵ سے ۸۵ برس کی عمر کے درمیان تھے۔

جب بھی آپ انگلستان میں ہوتے یا دیگر ممالک کا دورہ کرتے تو آپ جماعت کے ہر رکن سے ملاقات کرتے جس سے ملنا ممکن ہوتا تاکہ ان کی تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ ان تمام ملاقاتوں کے لئے اکثر اوقات آپ نہایت معمولی اور غیر آرام دہ ذرائع آمدورفت، جیسے بس وغیرہ کو استعمال کیا کرتے تھے اور نہایت معمولی درجے کی اور غریبانہ رہائش بھی اختیار کر لیتے تھے۔ میں نے آپ کو ان لوگوں سے ملاقات کرتے اور اپنے ذاتی آرام کا خیال کئے بغیر ان کے خستہ حال گھروں میں رہتے ہوئے دیکھا ہے جو کہ شمالی انگلستان کے گندے اور تاریک صنعتی علاقے میں واقع تھے۔ ایک مرتبہ جب آپ مذکورہ حالات میں وہاں قیام پذیر تھے تو آپ کے میزبان نے معذرت خواہانہ لہجے میں آپ سے عرض کی: ''مجھے افسوس ہے کہ جہاں میں رہائش پذیر ہوں، یہ کوئی خوشگوار مقام نہیں،'' جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا: ''میں یہاں لوگوں سے ملنے آیا ہوں، میرے لئے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ وہ خوشگوار ہوں۔''

آپ کے ساتھ سفر کے دوران بعض مواقع پر میں نے خدائی ہاتھ کی معاونت کو محسوس کیا۔ ہمارے سفر کے دوران نہایت غیر متوقع باتیں ہوئیں جنہوں نے ہمیں تکالیف سے محفوظ رکھا۔ ایک مرتبہ ۱۹۷۹ء میں جب ہم کار پر کسی شخص سے ملنے جا رہے تھے تو میری ناقص راہنمائی کے باعث ہم غلط موڑ مڑ گئے اور قطعی اتفاقی طور پر ہم اس شخص کے بھائی کے گھر کے سامنے سے گزرے جو کہ ہماری منزل سے چند گلیاں ہٹ کر تھا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ

جب ہم وہاں سے گزر رہے تھے تو اس کے بھائی، اپنے گھر کے باہر ہی کھڑے تھے۔ ہم ان سے بات کرنے رک گئے۔ ان سے ہمیں معلوم ہوا کہ ان کے بھائی جس سے ہم ملاقات کرنے جا رہے تھے۔ وہ ہسپتال میں داخل تھے۔ لہذا ان کے گھر جانا ایک بے کار سفر ہوتا۔ بعد ازاں ہم اس شخص کی عیادت کے لئے ہسپتال چلے گئے۔

۱۹۸۶ء سے قبل ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے انگلستان کے دورہ جات کے دوران ایک ایسا دور تھا جب انگلستان میں جماعت کئی ایک مسائل سے دوچار تھی جو کہ ظاہراً ناقابل حل دکھائی دیتے تھے۔ آپ ہمارے لئے تقویت اور ہمت افزائی کا سرچشمہ تھے۔ کئی مرتبہ ہمیں عید جیسی تقریبات بھی لندن کے مختلف مقامات پر کرائے کی عمارات میں منعقد کروانی پڑیں۔ ان مواقع پر اگر آپ انگلستان میں موجود ہوتے تو شرکت کے لئے ضرور تشریف لاتے۔

اس وقت انگلستان کی جماعت کو ایک مرکز کی شدید ضرورت تھی اور انہوں نے عمارت خریدنے کے لئے تقریباً پانچ ہزار پاؤنڈ اکٹھے کر لئے تھے۔ ۱۹۸۱ء میں دورہ انگلستان کے دوران ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے ہمیں مطلع فرمایا کہ آپ امریکہ کے آئندہ دورے کے دوران وہاں سے اس عمارت کے لئے مزید پانچ ہزار پاؤنڈ اکٹھے کرنے کی کوشش کریں گے۔ جب آپ نے امریکہ کے احباب جماعت کے ایک اجلاس میں اس سلسلے میں اپیل کی تو اللہ نے احباب کے دل اس قدر کھول دیئے کہ توقع سے چار گناہ زیادہ رقم اکٹھی ہوگئی۔ جب ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد اس فنڈ سمیت لندن پہنچے تو آپ نے رقم جمع کروانے کی خاطر ایئرپورٹ سے فوراً بینک کا رخ کیا۔

اسی بناء پر ۱۹۸۲ء میں ویمبلے کے علاقہ میں ہماری توقعات سے بڑھ کر وسیع عمارت خرید لی گئی۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اسی برس اس عمارت کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ (انٹرنیٹ کے ہمارے عالمگیر صفحات پر ایک تصویر پیش کی گئی ہے جس میں اس مذکورہ موقع پر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو خطبہ کی شکل میں اس عمارت کی افتتاحی تقریر کرتے دکھایا گیا ہے)۔

مجھے اس خصوصی اجتماعی میں ایک نہایت مفید نصیحت یاد ہے جو آپ نے کسی دوسری تقریر میں کی تھی۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''اگر آپ لوگ علی الصبح بیدار ہو جائیں تو نماز کے بعد کا وقت مذہبی مطالعہ اور کام کرنے کے لئے نہایت مناسب ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت آپ اپنی روزمرہ کی دنیاوی مصروفیات میں نہیں الجھے ہوتے اور یہ پرسکون وقت نہایت تعمیری ثابت ہوسکتا ہے۔''

فی الحال میں نے محض ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے انگلستان کے دورہ جات کی یادوں کا ہی ذکر کیا ہے۔ جماعت احمدیہ لاہور، کے لاہور میں منعقد ہونے والے کئی سالانہ جلسوں میں جن میں میں نے شرکت کی، مجھے آپ کو مشاہدہ کرنے، آپ کے ہمراہ کافی دیر تک وقت گذارنے اور کام کرنے کا موقع میسر آیا۔ اس دوران میں کئی ایسے واقعات مجھے یاد ہیں جو کہ نہایت روح پرور حیثیت کے حامل ہیں۔

۱۹۷۶ء کے اوائل میں، جب میں نے آپ سے درخواست کی کہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتا ہوں تو آپ نے ارشاد فرمایا ''درحقیقت وہ شخص جس کے ہاتھ پر لوگ بیعت کرتے ہیں، روحانی لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجے پر ہونے چاہیے جو کہ میں نہیں ہوں''

اس پر میں نے کہا: ''مگر ہم یقین رکھتے ہیں کہ آپ ہیں۔'' یہ سنتے ہی آپ پر عاجزی اور اللہ کے خوف سے کپکپی طاری ہوگئی اور آپ نے استغفر اللہ کہا۔

جب آپ سالانہ جلسہ کے موقع پر آ کر جلسہ گاہ میں تشریف رکھتے تو

یوں محسوس ہوتا کہ جلسہ کی حرمت اور تقدیس میں کئی درجہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ہم آپ کے افتتاحی اور اختتامی خطبات کے بے چینی سے منتظر رہتے تھے۔ خاص طور پر ہر جلسہ کے اختتام پر آپ کا اختتامی خطبہ دلوں کو پگھلا دینے والا اور روح کو مصفا کر دینے والا ہوتا تھا۔ اس اثر کو الفاظ میں مناسب طور پر بیان کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی اسے دماغ میں دوبارہ دوہرایا جاسکتا ہے بلکہ اسے صرف اس موقع پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ اختتامی دعا، جس میں دوسرے لوگ بھی ہاتھ اٹھا کر شامل ہوتے، آپ کی اللہ کے حضور عاجزانہ گڑگڑاہٹ، ہر آنکھ سے اس طرح آنسو بہا دیتی تھی کہ وہ دلوں کی گہرائی سے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے اور ہمیں یونہی احساس ہوتا جیسے ہم اللہ کے حضور بذات خود حاضر ہو کر دعا کر رہے ہیں۔

۱۹۹۴ء کے سالانہ دعائیہ کے ایک ایسے ہی اختتامی اجلاس کا ہی شاہد ہوں (جو کہ آپ کی زندگی کے آخری جلسوں میں سے تھا) اس موقع پر قوت تحریک اور روحانی طاقت کا شاندار مشاہدہ کرنے کو ملا۔ آپ کا اختتامی خطبہ اور دعا حتی کہ آپ کی موجودگی اس وقت انتہائی متاثر کرنے والی تھی اور جب آپ جلسہ گاہ میں لوگوں کے درمیان سے سلام کرتے ہوئے گزر رہے تھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں اصل حاضرین سے کہیں زیادہ ایک عظیم جم غفیر موجود ہے۔ بعد ازاں بذات خود اس بات کا ذکر کیا کہ انہوں نے مذکورہ موقع پر ایک غیر معمولی روحانی کیفیت محسوس کی تھی۔

اگرچہ مذہبی روایات کو مشکوک نظر سے دیکھنے والے اور دنیاوی ذہنیت کے حامل لوگ اس بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کر سکتے ہیں ایک مقدس ہستی کے گرد ہی قائم ہوسکتا ہے۔ جس میں فرشتے حاضرین کے دلوں کو تقویت پہنچانے کے لئے نازل ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے دور میں کبھی فرشتوں کو اہل ایمان کی تقویت کے لئے آسمان سے نازل ہوتے محسوس کرنے کا موقع ملا ہے تو ایسا ہمارے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب جیسے بزرگوں کے ذریعہ ہی ممکن ہوا ہے۔

لاہور میں مجھے آپ کی جس خوبی کے مشاہدے اور اس سے مستفید ہونے کی سعادت حاصل ہوئی وہ حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا ہر ایک سے ملنا، مہمان نوازی اور غیر رسمی رویہ تھا۔ جو بھی چاہتا آپ سے کسی بھی وقت مل سکتا تھا اور بلا تکلف جا کر آپ کے پاس بیٹھ کر بات کر سکتا تھا۔ حتی کہ آپ کی بیماری کے آخری تین برس میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، سوائے اس وقت کہ جب آپ کو زیادہ آرام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آپ مہمان کی تواضع کے لئے کھانے پینے کی اشیاء لانے کو کہتے اور نہایت شفقت سے ہمارے سامنے رکھتے۔ بعض دفعہ آپ بذات خود پھلوں کے چھلکے اتارتے اور پھل ہماری پلیٹ میں رکھ دیتے۔ آپ کا یہ مشفقانہ رویہ مجھے بعض اوقات مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتا کہ جب آپ ہم سے رخصت ہو جائیں گے تب ہم آپ کی کمی کتنی محسوس کریں گے؟ ہم نے اسلام کے حقیقی روحانی راہنماؤں میں ایسی خوبیوں کی موجودگی کے بارے میں پڑھ اور سن رکھا تھا کہ وہ تنہائی اور مصنوعی نمود و نمائش پر مبنی زندگی (جو کہ موجودہ مفاد پرست مذہبی راہنماؤں میں عام ہے) کی بجائے اپنے پیروکاروں کے ساتھ مشفقانہ انداز میں گھل مل کر بیٹھتے۔ ان کے کام آتے اور ان کے آرام کا خیال رکھتے اور ان کا خوش دلی سے استقبال کرتے اور یہ سب کچھ میں نے حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب سے دیکھا۔

آپ نہایت سادہ اور دیندار زندگی بسر کرنے پر یقین رکھتے تھے اور اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں اسلام کی تعلیمات، آنحضرت محمدؐ کے اسوہ حسنہ اور تحریک احمدیہ کے عظیم مردوں اور خواتین کے نمونوں پر عمل پیرا ہوں۔ لہٰذا مذہبی فرائض کی ادائیگی کے علاوہ معاشرتی معاملات میں بھی آپ ان بے کار تفصیلات پر مبنی تقریبات، رسم و رواج اور تکلف کے سخت خلاف تھے جو کہ بدقسمتی سے مسلمانوں میں مروج ہیں۔ چونکہ

ہمارے مرحوم راہنما نے ان بے بنیاد رسم ورواج اور تقریبات (جن میں اکثر شادی اور مرگ سے متعلق ہوتی ہیں) کو مسترد کر کے ہمارے لئے درخشاں مثال قائم کی ہے تو اب ہم سب پر لازم ہے کہ ایسی بے حقیقت باتوں کو اپنی زندگی سے نکال باہر کریں ورنہ ہم اپنی تحریک سے باہر کے مسلمانوں کو کس طرح اس بارے میں تبلیغ کر سکتے ہیں؟

میں آپ کی قیادت کے دو مزید پہلوؤں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جن سے ہماری تحریک بے انتہا مستفید ہوئی ہے اور جو ہمارے لئے ایک نمونہ ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کے وہ ان تھک سفر ہیں جو آپ نے مرکز اور اس کی شاخوں کے درمیان رابطے کو تقویت دینے کے لئے دنیا کے مختلف حصوں میں کئے۔ آپ کے ان ذاتی سطح کے رابطوں نے دنیا بھر میں تحریک میں ایک نہایت بیش قیمت اور مستحکم رشتہ قائم کرنے میں مدد دی۔ آپ جہاں بھی تشریف لے گئے وہاں جماعت کے ہر معمولی رکن سے بھی ملاقات کی۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ اپنی مضبوط یاداشت کی بناء پر آپ دوسروں کی بتائی ہوئی تمام ذاتی تفصیلات بھی یاد رکھتے تھے اور اگر آپ کسی شخص سے دوبارہ ملاقات کرتے تو اسے یہ بات بتانے کی ضرورت پیش نہیں ہوتی تھی کہ وہ کون ہے۔ یا کوئی اور بات جو اس شخص نے اپنی پہلی ملاقات کے دوران آپ کو بتائی ہو۔ اگرچہ یہ سب کچھ غیر معمولی معلوم ہوتا ہے مگر یونہی محسوس ہوتا تھا کہ حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ہر فرد کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔

دوسرا پہلو حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی ان افراد کے لئے عزت قدر اور حوصلہ افزائی ہے جو جماعت کے لئے مخلصانہ اور بے لوث انداز میں کام کرتے ہیں۔ آپ انہیں جماعت میں آگے لانے کے لئے مشتاق رہتے تھے اور انہیں ذمہ دار حیثیت پر مقرر کرتے تھے تاکہ جماعت ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ اگر کوئی شخص مخلص اور باصلاحیت ہوتا تو آپ اس کے پس منظر، عمر، حیثیت، خاندان کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے۔ آپ صلاحیتوں کی پہچان کر لیتے اور ان کی ترقی کے لئے حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب بہت سی ایسی خوبیوں کے مالک تھے جن کا نہ صرف ایک حقیقی مسلمان راہنما میں بلکہ کسی بھی تحریک کے انتظامی سربراہ میں ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی اور اللہ کی خاص نعمت تھی کہ ایسی ہستی ہم میں موجود تھی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہماری جماعت نے آپ کو راہنما منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے ہمارے نصب العین کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور اپنے دل و دماغ کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس کے لئے وقف کر دیا۔ جب سے میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اس جماعت کی ترقی کے لئے ہی وقف کیا۔

آپ ہم سب کے لئے تقویت اور تحفظ کا سرچشمہ تھے۔ قرآن کریم کی ایک تمثیل کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ہمارے لئے ایک مضبوط درخت کی مانند تھے جس کی گہری مستحکم جڑیں اور بلند شاخیں ہوتی ہیں۔ اور جس کے سائے تلے ہم نے ایک عرصہ تک محفوظ اور آرام دہ پناہ حاصل کی۔ آپ اس وقت اللہ کے حضور گریہ وزاری کرتے جبکہ ہم اس احساس کے ساتھ پرسکون نیند سوئے ہوتے تھے کہ آپ موجود ہیں۔ اب جبکہ آپ نے اپنا فرض پورا کر کے ہمارے لئے نمونہ قائم کر دیا اور رخصت ہو گئے ہیں تو ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر آن پڑی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے:

''سب جو اس کے اوپر ہیں، فنا ہونے والے ہیں اور تیرے رب کی ذات باقی رہتی ہے جو جلال اور عزت والا ہے'' (القرآن ۳۵:۲۶، ۲۷)

محترم امیر قوم اور محترم سامعین۔

مجھے آج پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے کہا گیا ہے، پروفیسر صاحب سے ہمارا بہت قربت کا تعلق تھا یعنی نہ صرف مجھ سے بلکہ میرے پورے خاندان اور اہل خانہ سے، وہ بڑوں کے خلیل، ہمارے خلیل پاجی اور بچوں کے چاچی تھے، وہ میرے استاد محترم تھے اور تحدیث نعمت کے طور پر میں اس بات کا اظہار کرنا چاہوں گی کہ پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب جیسی معتبر ہستی سے متعلق اگر میں کچھ بیان کرسکوں تو وہ انہی کی تعلیم وتربیت کی بدولت ہے اور میں یہ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ سکول کے تعلیمی دور میں میرے رہنما اور استاد نہ ہوتے تو شاید میں کبھی بھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کرپاتی۔

میرے بہن بھائیوں کے بھی وہ استاد تھے اور سب آپ کی تعلیم سے مستفید ہوئے۔ انہوں نے ہماری تربیت کی، ہمیں نظم ونسق اور کام میں باقاعدگی کی تعلیم دی اس کے علاوہ بھی ہماری کردار سازی میں اُن کا نمایاں حصہ ہے۔ چونکہ ہمارے والد سینٹوریم میں رہتے تھے اور وہ ہمارے ساتھ رہتے تھے تو چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ کام میں کسی بے قاعدگی کو آپ پسند نہ فرماتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو آپ کے نظم وضبط سے کوئی تکلیف ہوتی ہو لیکن چونکہ مجھے خود ضابطہ اور باقاعدگی سے کام کرنے کی عادت تھی، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے مجھے ڈانٹا ہو۔ اسکول سے آنے کے بعد جب وہ مجھے پڑھانے بیٹھتے تھے تو سکول کی دن بھر کی ساری روئیداد میں انہیں سناتی تھی پھر وہ کہتے تھے کہ ''اچھا اب پڑھیں''؟۔ وہ مجھے حساب اور انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور مجھ سے حساب کا ایک سوال حل نہ ہوسکا۔ گھر آکر پاجی کو بتایا تو زندگی میں، پہلی مرتبہ انہوں نے مجھے غصے سے دیکھا اور کہا ''کیوں؟'' میں پہلے ہی بہت گھبرائی ہوئی تھی اور زیادہ پریشان ہوگئی۔ وہ شام تک مجھ سے ناراض رہے، شام کو راضی ہوئے، پرچہ دیکھا، سوال حل کیے تو معلوم ہوا کہ میرا طریقہ ٹھیک تھا سوال بنانے والے کی غلطی تھی۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہوگیا۔

سورۃ الضحٰی کی جو آیات 6 تا 11 میں نے تلاوت کی ہیں ان میں پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب محترم کی زندگی کا مکمل عکس نظر آتا ہے۔ آیات کا ترجمہ اس طرح ہے:

ترجمہ: ''کیا اس نے تجھے یتیم نہیں پایا سو پناہ دی، تجھے طالب پایا تو راستہ دکھایا اور تجھے تنگ دست پایا تو غنی کردیا سو یتیم پر سختی نہ کر اور سوالی کو نہ ڈانٹ اور اپنے رب کی نعمت کا ذکر کرتا رہ'' (سورۃ الضحٰی 6 تا 11)

یتیم پا کر جب پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کو اپنوں نے دھتکار دیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو ایک محفوظ اور مامون پناہ گاہ میں لے آیا اور آپ کا خود ولی اور وارث ہوگیا۔ خود رہنمائی فرمائی اور آپ کو غنی کردیا۔ آپ کو وہ بلند کردار، حلیمی، صبروتحمل، خودداری اور قناعت عطا فرمائی جو ہر ایک کے لئے قابل رشک ہے اور اپنے رب کی نعمتوں کی آپ نے عملی طور پر تحدیث فرمائی۔ علم کا کوئی طالب اور سائل آپ کے در سے خالی نہیں لوٹا، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی سب حاجتیں

پوری کر دیں اور آپ کو غنی کر دیا تو مالی تعاون اور علمی تعاون میں آپ نے کبھی بخل نہیں کیا اور تمام عمر اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ ہزاروں طلباء کو آپ نے پڑھایا، دوستوں کے بچوں کو، کالج میں سکول میں اور اپنے بچوں اور آگے اُن کے بچوں کو۔ علم بانٹتے بانٹتے آپ نے اپنی تمام زندگی گزار دی اور کبھی کسی سے کوئی معاوضے یا مراعات کے طلب گار نہیں ہوئے۔ آپ خوددار انسان تھے اور اُن کی سوچ یہی تھی کہ میری ضرورت جب اللہ تعالیٰ نے پہلے پوری کی ہے تو وہی رحمٰن اور رحیم اب بھی میری ضرورت پوری کرتا رہے گا اور اسی طرح تمام زندگی آپ نے دوسروں کی تعلیم و تربیت کرنے میں لگا دی۔

اب میں پروفیسر صاحب کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ بتانا چاہوں گی۔

پروفیسر صاحب کا آبائی وطن ہری پور کے قریب ایک گاؤں کچھی نامی ہے ،ان کے دادا کا نام اخونزادہ گل احمد اور والد کا نام اخونزادہ محمد اسحاق تھا، آپ کا خاندان اپنے علم کی وجہ سے اور اس علاقہ میں سب سے زیادہ صاحب جائیداد اور جرات مند ہونے کی وجہ سے اور مردانہ وجاہت کی بنا پر گردونواح کے تمام گاؤں اور علاقے میں بہت بااثر اور بارسوخ تھا، لیکن ایسا ہوا کہ 1917ء کے موسم سرما میں انفلوئنزا ایک وبائی صورت میں پھیلا۔ عام طور پر لوگ اسے جنگی بخار بھی کہتے تھے، یہ وباء جب علاقہ کچھی میں پھیلی تو پروفیسر صاحب کے والدین یعنی ماں باپ دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے گئی اور ایک ہفتے کے اندر آپ کے والدین کو آپ سے چھین لیا۔ آپ کی ایک دوسری والدہ نے جن کو آپ ''بڑی ماں'' کہا کرتے تھے، چھوٹے چھوٹے دونوں یتیم بھائی اور بہن کو سینے سے لگا لیا اور پروفیسر صاحب جب پانچ سال کے ہوئے تو انہیں ایک پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ پروفیسر صاحب سے کہا کرتی تھیں کہ تمہارے باپ کا خیال تھا کہ وہ تمہیں پڑھنے کے لئے لندن بھیجیں گے۔ میں تمام جائیداد بیچ کر بھی اُن کا خواب پورا کروں گی اور تمہیں لندن بھیجوں گی، مگر آپ کے رشتہ داروں نے انہیں بہت ستایا اور مجبور کر دیا کہ وہ اپنے میکے، دوسرے گاؤں میں چلی جائیں۔ اور خود آپ کے سرپرست بن کر آپ کی جائیداد پر قابض ہو گئے اور ان دو معصوم یتیم بچوں کو دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی بھی اپنی ہی جائیداد میں سے جھڑکیوں اور طعنوں کے بغیر میسر نہ رہی تو تعلیم و تربیت کا کیا سوال؟ اس کے علاوہ جسمانی مشقت بھی اُن کو کرنی پڑتی تھی اور خوراک بھی کم ملتی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت شدید بیمار ہو گئے اور پیچش کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ان کی جائیداد پر قابض رشتہ دار انہیں کھانے میں زہر ملا کر دیتے تھے کہ جائیداد کا وارث باقی نہ رہے۔ یہ روایت درست ہے یا نہیں۔ (واللہ اعلم)

جن دنوں میں کم سن لڑکا خلیل بے حد بیمار پڑ گیا، اُن دنوں میں دیبگراں کے مولوی محمد یحییٰ صاحب کا کچھی آنا ہوا۔ وہ اکثر وہاں جایا کرتے تھے کیونکہ اس گاؤں میں بہت سے گھر احمدیوں کے تھے۔ مولوی حکیم محمد یحییٰ صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ اخونزادہ گل احمد کا پوتا بیمار ہے۔ آپ نے خلیل کو بے حد بیمار پایا، افاقہ کے لئے دوا دی اور اُن کے رشتہ داروں کو بچے کے مستقل علاج کے لئے دیبگراں بھیج دینے کا مشورہ دیا۔ تو اس طرح نو سال کی عمر میں آپ دیبگراں آ گئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہو گئے۔ مولوی حکیم محمد یحییٰ صاحب اور آپ کے چھوٹے بھائی مولوی محمد یعقوب صاحب نے آپ کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔

پروفیسر صاحب جلد ہی نئے ماحول سے مانوس ہو گئے خصوصاً وہ مولوی محمد یعقوب صاحب سے زیادہ مانوس تھے۔ اُن ایام کا ایک واقعہ پروفیسر صاحب بطور لطیفہ سنایا کرتے تھے۔ گھر میں نئے نئے آئے تھے اس لئے رشتوں کی اتنی پہچان نہ تھی۔ انہوں نے مولوی محمد یعقوب صاحب سے شکایت کی کہ گھر میں ایک لڑکی نے مجھے دھکا دیا ہے اور تھپڑ مارا ہے۔ گھر میں دوسرے لڑکے لڑکیاں بھی تھیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ جس لڑکی نے تمہیں مارا ہے اور جس طرح مارا ہے تم بھی اسے اسی طرح مارو۔ انہوں نے اس لڑکی کو زور سے تھپڑ لگایا۔ بعد میں دوسرے بچوں نے بتایا کہ تم نے یہ کیا کیا ہے۔ یہ تو مولوی صاحب کی بیٹی

ہے، وہ لڑکی میری والدہ زینب تھیں جو پروفیسر صاحب کی ہم عمر تھیں۔اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہمارے بزرگ کس قدر انصاف کرتے تھے اور اپنے بچوں کی غلطی پر اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھتے تھے جو دوسروں کے ساتھ ہوتا تھا۔

پروفیسر صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم مانسہرہ اور دیگر اس میں حاصل کی، پھر مولوی محمد یعقوب صاحب آپ کو لاہور لے آئے اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب کی وساطت سے انجمن حمایت اسلام کے یتیم خانہ میں داخل کروادیا اور آپ اچھرہ کے مڈل سکول میں تعلیم پانے لگے کچھ عرصہ احمدیہ انجمن لاہور کے بدوملہی کے سکول میں بھی تعلیم پائی اور میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج پشاور سے 1937ء میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔پروفیسر صاحب نے ای۔ اے سی کا امتحان دیا۔جو کہ اس زمانہ میں اعلیٰ ملازمت کے مقابلہ کا امتحان ہوتا تھا۔اس میں آپ کامیاب ہوگئے۔مگر جیسا کہ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ شومئ قسمت انسان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔اور بعض اوقات کامیابی سامنے آکر ایک جھٹکے سے چلی جاتی ہے اور یہی ہوا کہ تقرری کے وقت ان کی عمر 25 سال سے دو مہینے تجاوز کر چکی تھی اور اُن کو ملازمت نہ مل سکی۔اسی طرح آپ کا میڈیکل کالج میں اور ایم ایس سی میں داخلے کا خواب بھی پورا نہیں ہوسکا۔اور آپ نے مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے محکمہ تعلیم میں ملازمت کرلی گو کہ یہ اُن کی اپنی خواہش نہ تھی۔آپ کی قابلیت سے متاثر ہوکر آپ کے سینئر افسران نے آپ بی۔ٹی BT کے لئے منتخب کرلیا اور انہیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھیج دیا۔علی گڑھ یونیورسٹی میں آپ کے ذاتی جوہر کھل کر سامنے آنے لگے، آپ ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، دوران تعلیم پریکٹس ٹیچنگ میں آپ نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔جس کی بناء پر آپ کو بمبئی میں ہونے والی ایک خاص تقریب میں شمولیت کے لئے ایک ٹیم میں شامل کیا گیا۔وہاں ان کو قائداعظم سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔اُن کا کہنا تھا کہ وہ میری زندگی کا خوش قسمت ترین دن تھا جب میں نے قائداعظم کو قریب سے دیکھا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ صوبہ سرحد کے مختلف مقامات پر اسکولوں میں پڑھاتے رہے۔اسی دوران آپ کو کلکتہ میں ماہی پروری یعنی مچھلیوں کی پرورش اور افزائش کی ٹریننگ کے لئے منتخب کیا گیا، واپس آکر آپ نے ہزارہ کے مختلف دریاؤں اور ندیوں سے مچھلیاں پکڑ پکڑ کر تجربات کئے اور ایک ریسرچ پیپر لکھا، جو بے حد معیاری اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔خیال تھا کہ انہیں مزید تربیت کے لئے لندن بھیجنے کے لئے منتخب کیا جائے گا مگر یہاں بھی ایک سفارشی آگے نکل گیا۔

1944 میں آپ کی شادی محترم احمد صادق کی ہمشیرہ خورشیدہ بیگم سے ہوگئی جس کے بعد آپ اسی خاندان کے ہوگئے اور دیکھنے والوں کو جو اُن کو اچھی طرح نہ جانتے تھے، یہ معلوم نہ ہوسکتا تھا کہ آپ احمد صادق صاحب کے سگے بھائی ہیں یا بہنوئی ہیں، آپ نے احمد صادق صاحب کے بچوں کو اپنی اولاد سمجھا اور آپ کی زوجہ محترمہ نے بھی ان بچوں کی پوری طرح سے نگہداشت اور پرورش کی اور اُن کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔احمد صادق صاحب کی بیٹی عابدہ کی شادی آپ نے اپنے بھانجے کرنل شیر احمد صاحب سے کروادی۔شیر احمد صاحب کے بچوں کے نام کے ساتھ ''خلیل'' کا اضافہ کیا گیا ہے اور یوں آپ کا نام اُن کی نسل میں آگے چل رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو 1948ء اور 1951 کے عرصہ میں ایک موقع عطا فرمایا اور آپ نے اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر پنجاب یونیورسٹی لاہور میں MSC میں داخلہ لے لیا۔آپ نے ذیالوجی میں ایم ایس سی کیا اور اوّل درجہ میں پاس ہوکر سونے کے تمغے کے حقدار ٹھہرے۔بطور زمیندارہ لیکچرار آپ کی پہلی ملازمت زمیندارہ کالج گجرات میں تھی۔اس کے بعد 1951 سے 1969ء تک گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں تعینات رہے۔1969 سے 1972ء تک پرنسپل گورنمنٹ کالج مانسہرہ رہے۔پروفیسر صاحب ایک کامیاب استاد تھے، نسل درنسل ہزاروں طالب علموں کو آپ نے تعلیم دی۔آپ کا اندازِ تدریس ایسا تھا کہ ایک ایک لفظ ذہن نشین ہوجاتا تھا۔آپ اپنے شاگردوں سے نہایت شفقت سے پیش آتے تھے اور بے حد ہر دلعزیز تھے۔طالب علموں میں اپنے رفقائے کار میں اور

عام لوگوں میں آپ کی بے حد عزت تھی۔ لوگ آپ کا نام عزت سے لیتے تھے۔ جب آپ مانسہرہ میں پرنسپل ہو کر گئے تو کالج کا کوئی نظام نہ تھا۔ نہ کوئی طالب علم کلاس میں ہوتا تھا اور نہ کوئی استاد کالج میں موجود ہوتا تھا۔ طالب علم بازاروں اور گلیوں میں گھوما پھرا کرتے تھے۔ انہوں نے وہاں ڈسپلن قائم کیا۔ تین سال انہوں نے اس کالج میں گزارے تو استاد اور طالب علم کالج میں حاضر ہونے لگ گئے اور اچھی فضا قائم ہوگئی۔ مگر پھر وہی احمدیت کی مخالفت شروع ہوگئی اور آپ کو تکالیف پہنچائی گئیں لیکن آپ کی ریٹائرمنٹ بھی قریب تھی اور باعزت ریٹائر ہو گئے۔

1974ء میں جو سانحات جماعت احمدیہ لاہور کو پیش آئے اس سے پروفیسر صاحب بھی متاثر ہوئے۔ اور جب ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب لاہور مرکز میں تشریف لائے تو پروفیسر صاحب بھی مرکز میں آگئے اور دارالسلام میں رہائش اختیار کی، انہوں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنی زندگی کے تین سال جماعت کے لئے وقف کریں گے اور بلاتنخواہ خدمات انجام دیں گے۔

جب آپ نے دارالسلام میں رہائش اختیار کی تو یہاں کے رہنے والوں کے ساتھ ان کا ایک خاص تعلق پیدا ہوگیا اور عزت و احترام کا رشتہ قائم ہوگیا اور اب بھی وہ لوگ آپ کو بہت عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے جماعت کے جائنٹ سیکرٹری اور پیغام صلح کے ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ اگر کسی کو موقع ملے تو 1925ء سے آگے کے چند سالوں کے پیغام صلح کے اداریوں کو پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ ان کے اداریئے کتنے موثر ہوتے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ پروفیسر صاحب کے اداریوں نے انہیں جماعت سے دوبارہ وابستہ ہونے میں مدد دی ہے۔ اُن کا اندازہ بیان بے حد پُر اثر تھا۔ ایک ایک لفظ سننے والوں کے ذہنوں میں نقش ہو جاتا تھا۔ واقعات بے حد دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے تھے۔ ربوہ کے اس وقت کے خلیفہ مرزا طاہر احمد کے اعتراضات اور تحریرات کے دندان شکن جوابات انہوں نے تحریر فرمائے۔ ان کا وجود جماعت کے لئے خاص تقویت کا باعث تھا۔ وہ صاحب الرائے انسان تھے۔ قدم قدم پر حضرت امیر سوم کے ساتھ مشاورت میں شامل تھے اور اندرون ملک دوروں میں ساتھ تشریف لے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں رشدی نامی شخص نے ایک غیر اخلاقی کتاب لکھی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اس کے جواب میں بھی ایک مضمون لکھا تھا۔ ایک اور مضمون جو اس وقت شائع نہیں کیا جا سکا تھا وہ آپ کے خاندان کے لوگوں کے پاس موجود ہے۔

پروفیسر صاحب بنیادی طور پر استاد تھے۔ لاہور آنے کے بعد جماعت کے بچوں اور نوجوانوں کی تربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ شبان کی قدم قدم پر رہنمائی کی۔ اُن کے ہر پروگرام میں شریک رہتے تھے۔ انہوں نے ایک جلسہ سالانہ کے موقع کے لئے ایک مکالمہ لکھا، جس میں حضرت صاحب کے دعووں اور جماعت کے عقائد کو واضح کیا گیا تھا۔ شبان کے جلسہ میں دو بچیوں مدیحہ رسول اور راجہ افضل صاحب کی بیٹی شاہدہ نے اسے سٹیج پر پیش کیا۔ اسے اس قدر سراہا گیا کہ اگلے دن جلسہ کی ایک نشست میں اسے دوبارہ پیش کیا گیا۔ تو ان دونوں بچیوں کو انجمن کی طرف سے انعامات دیئے گئے۔ کچھ حاضرین نے بھی انعامات دیئے جو ان بچیوں نے خوشی خوشی چندے میں جمع کروا دیئے۔

پروفیسر صاحب نے ایک مضمون بعنوان ''جماعت احمدیہ ماضی، حال اور مستقبل'' لکھا تھا۔ یہ بھی شبان کے جلسے میں پیش ہوا۔ ماضی کی نمائندگی آپ نے خود کی اور انجمن کے تمام کاموں کا خصوصاً انجمن نے جو علمی ذخیرہ پیدا کیا اور دیگر سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ بزرگوں کی روایات، جلسوں کی باتیں، یہ سب انہوں نے خود بیان کیں۔ مسعود اختر صاحب نے حال کے حوالے سے جو کام اس وقت کے امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی قیادت میں ہو رہے تھے۔ اُن کا ذکر کیا۔ بالخصوص باہر کے ملکوں میں قائم مشنوں کو کس طرح فعال بنایا اور تراجم کا کام شروع کروا دیا اور ہمارے بہت ہی پُرجوش نوجوان مقرر زاہد جنجوعہ نے جماعت کے مستقبل کا رول ادا کیا اور بتایا کہ احمدیت کا مستقبل روشن ہے اور وہ شبان ہونے کے ناطے کیا کچھ کام کر رہے ہیں۔

بہت سے لوگوں نے پروفیسر صاحب کو اسٹیج پر بطور سٹیج سیکرٹری دیکھا ہوگا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان میں سے کون کون آج یہاں موجود ہے مگر جس طرح کا نظم و ضبط ان کے سٹیج سیکرٹری ہونے کے زمانہ میں تھا وہ بے حد منفرد تھا۔ میں یہ تو نہیں جسارت کر سکتی کہ یہ کیوں کہ اس سے پہلے یا بعد میں ایسا نہیں ہوا مگر یہ کہہ سکتی ہوں کہ ویسا منفرد انداز ان سے خاص تھا، جلسہ کی کاروائی میں ذرا بھر بھی بے ضابطگی

نظر آئے تو وہ بلا جھجک کہہ دیتے تھے کہ ایسا نہ کریں۔ یہاں بیٹھیں، باہر جائیں، خاص طور پر جب چندوں کی اپیل ہوتی تھی تو وہ اس بات کو یقینی بنا دیتے تھے کہ لوگ چندہ دیئے بغیر باہر نہ نکلیں۔ پروفیسر صاحب تقاریر کو اس خوبصورت انداز میں سمیٹتے تھے اور جو تبصرہ کرتے تھے وہ بھی بالکل ایک خاص انداز رکھتا تھا۔ مجھے ایک جلسہ کی بات یاد ہے کہ باہر سے آئے ہوئے ایک مہمان نے اپنی تقریر میں سارا وقت اس بات پر لگا دیا کہ یہاں کا انتظام اچھا نہیں، کھانا اچھا نہیں، صفائی درست نہیں، خیر بڑی دھواں دھار تقریر کر کے موصوف اسٹیج سے اترے اور پروفیسر صاحب نے ایک شعر میں اس کا جواب دے دیا۔ انہوں نے فرمایا:

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے

وہاں کنٹر سب بلوری ہیں، یہاں ایک پرانا مٹکا ہے

اس شعر کے ذریعے مقرر کو اپنا جواب ملا کہ ہم اپنے حال میں خوش ہیں۔

آپ کی صحت خراب رہنے لگی تھی آپ کو Diabetes ہو گئی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ امیروں کی بیماری مجھے کیسے ہو گئی ہے۔ یہ تو خوش خوراک امیر لوگوں کی بیماری ہے۔ میں تو عام سا غریب بندہ ہوں۔ کچھ عرصہ تو آپ کا دارالسلام میں قیام رہا۔ پھر آپ زیادہ عرصہ ایبٹ آباد میں ہی گزارتے تھے۔ وہیں سے مضامین اور اداریئے لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ایبٹ آباد سے لاہور آ چکے تھے اور صرف چند احمدی گھرانے اب وہاں آباد تھے۔ پروفیسر صاحب نے مسجد کو آباد رکھا۔ آپ خطبے دیتے تھے، درس دیتے تھے اور اس وقت، اُن کا وہاں پر موجود ہونا احمدیوں کے لئے تقویت کا موجب تھا۔ ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب جو آج کل ہمارے امیر ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ اُن کے وجود سے مجھے وہاں تقویت نصیب تھی اور اُن کے چلے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کس پائے کے خطبات اور تقاریر سے میں محروم ہو گیا ہوں۔ اس وقت جب 1984ء میں ایبٹ آباد کی مسجد کا کلمہ شہید کر دیا گیا، پروفیسر صاحب اور ڈاکٹر صاحب دونوں وہاں موجود نہ تھے۔ بعد میں پروفیسر صاحب نے شکستہ ٹکڑوں کو اٹھایا اور نامعلوم کن مجروح احساسات کے ساتھ ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کے حوالے کر دیئے۔ یہ غم اُن کے دل کو کھاتا تھا۔

پروفیسر صاحب نے جلسہ کبھی ضائع نہیں ہونے دیا۔ جوانی سے لے کر اپنی زندگی کے آخری جلسہ دسمبر 1993ء تک وہ جلسہ میں شریک ہوتے رہے۔ 1993ء کے جلسہ کے لئے، بیماری کے باوجود عزیزوں اور سفر سے روکنے کی کوشش کے باوجود آپ جلسے میں شریک ہوئے اور لاہور سے واپسی کے تین ہفتے بعد 23 جنوری 1994ء کو آپ کو تدفین کے لئے واپس لایا گیا اور اپنے بہت سے عزیزوں کے ساتھ یہاں پر دارالسلام کے قبرستان کو رونق بخشی اور ان چراغوں میں شامل ہو گئے جو زمین کے اندر بھی روشنی بکھیر رہے ہیں۔

ان کا دھیما دھیما سا انداز بیان دلوں کو مسحور کرتا تھا۔ سننے والے پرشوق تھے مگر بقول شاعر:

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اس پر ختم کرتی ہوں۔ میں خاص طور پر امیر قوم ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب آپ کے اہل خانہ، بالخصوص ڈاکٹر محمد احمد صاحب اور چوہدری نذر رب صاحب کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے آج کی اس تقریر کے لئے ضروری معلومات عطا فرمائیں۔

معلوماتی لیکچر برائے ''امراض قلب''

سنٹرل انجمن کے زیر اہتمام ماہِ نومبر میں دارالسلام لاہور، پاکستان میں ''امراض قلب کے مریضان'' کے لئے ایک مفید معلوماتی لیکچر رکھا گیا۔

یہ لیکچر محترم ڈاکٹر تنویر احمد صاحب نے دیا جو کہ گزشتہ دنوں امریکہ سے پاکستان گئے ہوئے تھے۔ اس لیکچر میں امراض قلب کے پیدا ہونے کی وجوہات، علامات اور بچاؤ کے طریقوں سے آگاہ کیا گیا۔

اس لیکچر کو امراض قلب کے مریضوں نے انتہائی مفید پایا اور ڈاکٹر تنویر احمد صاحب اور سینٹرل انجمن کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے جماعت کے احباب کے لئے ایسے مفید لیکچر کا اہتمام کیا۔

☆☆☆☆

حکم قرآن ’’سچے بنو اور سچوں کی معیت اختیار کرو‘‘

نوید احمد (بدوملہی)

ترجمہ: ’’اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اللہ کا تقویٰ کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔‘‘ (سورۃ التوبہ آیت 9:119)

سچائی یا صدق کے معنی راست گوئی، سچ بولنا اور اپنے عہد کو سچ کر دکھانا ہے۔ سچائی ایک ایسی صفت ہے جسے بلاشبہ اخلاقی خوبیوں میں سرفہرست رکھا جاتا ہے۔ انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہی ہے کہ اُس کے لئے اُس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔ جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہوتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لئے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے۔

صدق کے معنی سچائی اور اصلیت کے ہیں۔ صدق سے راست بازی نیک نامی اور تعریف کے معنی بھی نکلتے ہیں۔ صدق کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں مثلاً صدق لسانی، صدق قلبی، صدق عملی وغیرہ۔

صدق کے لغوی اور اصطلاحی معنی

لغت کے اعتبار سے اگرچہ صدق کے معنی سچ بولنا اور واقعہ کے مطابق بات کہنا کے کئے جاتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے صدق انسان کی زبان اور قول کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ مگر شریعت کی اصطلاح میں صدق کے تحت انسان کے قول کی طرح خود اس کا اپنا فعل بھی داخل ہے اور صدق فی الفعل کے معنی ہیں کہ انسان کی جو زبان ہے اس پر عمل بھی کرے۔ اس کو پورا بھی کرے۔ اس لحاظ سے صدق فی الفعل کا تعلق اپنی ذات سے ہو جاتا ہے جیسا کہ صدق فی القول کا تعلق غیر سے ہوتا ہے یعنی کسی کے متعلق جو بات کہے۔ بالکل سچی اور واقعہ کے مطابق کہے بالفاظ دیگر عربیت کی اصطلاح کے مطابق صدق فی القول: ’’خبر‘‘ ہے اور صدق فی الفعل ’’انشاء‘‘ ہے۔

قرآن مجید میں صدق کا کلمہ سچ بولنا، سچ کر دکھانا اور راست روی کے معنوں میں آتا ہے۔ فرقان حمید میں ہے ’’اور راست بازوں کے ساتھ رہو‘‘ صدق میں دل کی سچائی بھی شامل ہے۔ دل کی سچائی کا مطلب ہے کہ دل میں منافقت نہ ہو۔ جو دل میں ہو، وہی زبان پر ہو، جو زبان پر ہو وہی دل میں ہو اور دل میں وہی عمل ہو، جیسا ظاہر ویسا باطن ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہی لوگوں کو صادق کہا ہے اور اُن کے لئے انعامات رکھے ہیں۔ جو اُن کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے طرف سے بطور تحفہ ملیں گے۔ صدق کا شمار اُن اوصاف حمیدہ میں ہوتا ہے جن کی قرآن مجید میں بہت تاکید ہے۔ صدق کی چھ اقسام ہیں۔

صدق قولی

زبان سے بات نکالتے وقت سوچنا اور صاف صاف بات کرنا صدق قولی کہلاتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرقانِ حمید میں فرمایا ہے:

’’جو لفظ بھی انسان بولتا ہے فرشتے اسے نامہ اعمال میں لکھ لیتے ہیں‘‘

دوسری جگہ پر فرقان حمید میں فرمایا:

’’یہ دن ہے کہ جس دن سچ بولنے والوں کو اُن کا سچ فائدہ دے گا‘‘ اس لئے زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ سچائی پر مبنی ہونا چاہیے۔

صدق فعلی

صدق فعلی یہ ہے کہ آدمی جو بات بھی زبان سے نکالتا ہے اُسے وہ عملاً پورا کرے۔

صدق نیت:

انسان جو کام بھی انجام دے اس میں اس کی نیت سچی ہونی چاہیے، نیتوں

پر عملوں کا دارومدار ہے۔ اگر نیت نیک ہو تو نیکی ملے گی اور اگر نیت درست نہ ہو تو اس کا اجر بھی ویسا ہی ملے گا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ سب کام نیک نیتی سے کرے۔

صدق عزیمت

انسان جو کام بھی کرے پختہ ارادے کا پایا جانا ضروری ہے۔ کسی قسم کا تذبذب نہیں ہونا چاہیے۔ مومن کی تو پہنچان ہی یہ ہے کہ اس کے ہر کام میں ثابت قدستی ہوتی ہے، عزم سے کام کرتا ہے۔

صدق وفا

پس جو وعدہ بھی کرے اُسے ضرور پورا کرنا چاہیے۔ اگر وہ وعدہ کر کے وفا نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں ہے صدق وفا مومن کی پہچان ہے اگر صدق وفا نہیں تو منافق ہے۔ منافق کافر سے بھی بدتر ہوتا ہے۔

صدق دین

انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کے دین کو لوگوں کے دلوں تک پہنچائے اور خود اس پر عمل کرنے کی راہ میں جو بھی کٹھن وقت آئے اسے برداشت کرے۔ دین نے جو سچائی کا درس دیا ہے اسے دامن میں تھامے رہے۔ اپنی سیرت کو بھی کو شکل کے ساتھ ساتھ خوبصورت بنائے نبی پاک صلعم نے دعا سکھائی: ''کہ اے اللہ تو نے مجھے شکل اچھی دی ہے میری سیرت بھی اچھی کر دے۔''

اللہ سبحانہ تعالیٰ فرقان حمید میں صدق کے بارے میں فرماتے ہیں: ''صدق ایک ایسا اعلیٰ وصف ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں شمار کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کون اللہ سے بڑھ کر سچا ہو سکتا ہے''۔

قرآن مجید میں بے شمار وعیدیں آئی ہیں جو جان بوجھ کر صدق فی القول کی خلاف ورزی یا جان بوجھ کر جھوٹ بولتے اور واقعہ کے خلاف بات کرتے ہیں جن کا ذکر کچھ اس طرح آتا ہے جو جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹوں پر خدا کی لعنت تک کی تصریح ہے۔ اسی طرح صدق فی الفعل کی خلاف ورزی یعنی جو زبان سے کہنا اس پر عمل نہ کرنا۔ اس پر بھی شدید وعید آئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جو تم کرتے نہیں وہ زبان سے کیوں کہتے ہو۔''

(سورۃ الصف آیت 3)

یعنی بڑی بڑی بات ہے بلکہ زبردست اخلاقی کمزوری ہے کہ جو زبان سے کہو اس پر عمل نہ کرو۔ انسان کو اپنی زبان کا پاس ہونا چاہیے۔ چاہیے کچھ بھی ہو جائے۔ جو زبان سے کہا اسے پورا کرنا چاہیے گویا ایمان کے دعویٰ کے بالکل منافی ہے کہ جو تم زبان سے کہو اس پر عمل نہ کرو۔ یا جو عہد کرو اس کو پورا نہ کرو اسی پر بس نہیں بلکہ ارشاد ہے:

ترجمہ: ''بہت بڑی ناراضگی کا موجب ہے اللہ کے نزدیک کہ تم جو کہو اس پر عمل نہ کرو۔'' (سورۃ الصف آیت 3)

اس لئے ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ صادق القول یعنی ''راست گفتار'' بھی ہو اور صادق الفعل یعنی ''راست کردار'' بھی ہو۔ تب ہی وہ کامل مومن ہو سکتا ہے خدا کی ناراضگی اور قہر و غضب سے بچ سکتا ہے اور اگر کبھی دانستہ یا نادانستہ طور پر قول یا فعل میں جھوٹ سرزد ہو جائے تو فوراً اس سے توبہ و استغفار کرے اور اگر وہ قول یا فعل کسی دوسرے شخص کے حق سے متعلق ہو تو اس کی تلافی کرنا، یا اس سے معاف کرانا بھی از بس ضروری ہے۔

آج کل ہم مسلمانوں میں دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی جھوٹ بولتے ہیں۔ دونوں قسم کا اس قدر عام ہو گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اسے کوئی گناہ اور جرم نہیں سمجھتے بلکہ ''ہنر'' سمجھتے ہیں اسی لئے طرح طرح سے اللہ کا قہر و غضب ہم مسلمانوں پر نازل ہو رہا ہے۔

آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ جنگ تبوک میں نہ شریک ہونے والے اُن سچے مومنوں کا ذکر اور ان کی توبہ کے قبول ہونے کا اعلان فرمانے کے بعد جنہوں نے محض اللہ جل جلالہ کے ڈر، خوف کی وجہ سے جھوٹے منافقوں کی طرح جھوٹے بہانے تراشنے اور جھوٹ بولنے کے بجائے بالکل سچ سچ اپنے قصور اور جرم کا اعتراف کیا تھا۔ اور صدق دل سے توبہ کی تھی۔ ہر مومن کو اسی طرح خدا سے ڈرنے، سچ بولنے اور سچے لوگوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہ کے ہاں۔ اس سے ڈرنے

والے مقرب بندوں کی ایک جماعت ہے جس کا نام صادقین ہے۔ صادقین کی جماعت کا ایک سب سے اعلیٰ طبقہ بھی ہے جس کا نام صدقین ہے اُن کا درجہ انبیاء کرام کے بعد ہی ہے یعنی انبیاء کے بعد افضل البشر عام مخلوق سے افضل یہی ہیں۔

جن میں سب سے بڑھ کر صدیق اکبر یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ سرکار دو عالم نے اپنی اُمت کے ہر مومن مرد اور مومن عورت کو اس مرتبہ تک پہنچنے اور صدیقین میں شامل ہونے کی تدبیر بتلائی ہے۔

اللہ جل شانہ فرقان حمید میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''یقیناً تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آیا ہے، تمہارا تکلیف پانا اُس پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہارے لئے بھلائی کا خواہش مند ہے، مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔'' (سورۃ توبہ آیت168)

اس سورت کے آخر پر بتایا کہ یہ کوئی رسول کے آنے کی غرض نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ رسول کی حالت تو یہ ہے کہ جو کچھ تم پر تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ اس پر بھی شاق گزرتی ہیں۔ اور وہ چاہتا ہے کہ تم ان مصائب سے باہر نکل جاؤ۔ اور تم پر حریص ہے یعنی تمہاری بہتری کو چاہتا ہے یہاں تک لفظ عام ہیں یعنی جو کچھ دنیا میں گناہ اور غلطیاں ہیں اور جو کچھ اُن کی وجہ سے دنیا اپنے آپ کو مشقت اور ہلاکت میں ڈال رہی ہے اس سے رسول اللہ صلعم کا دل پگھلتا ہے، جنگ میں انسانوں کا خون بہتا ہے۔ اس سے اسے خوشی نہیں ہوتی۔ اگر لوگ کفر اور نفاق اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں تو اس سے اسے راحت نہیں ملتی بلکہ ان چیزوں کو دور کرنے کی تڑپ اس کے دل میں ہے اس آخری پیغام میں رسول صلعم کے قلب کی پہلی حالت کا ذکر کیا جو دنیا میں گناہ اور ہلاکت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور خدا سے مدد چاہی۔ بالمومنین رؤف الرحیم میں بتایا کہ اگر تم مومن بن جاؤ تو پھر وہ رسول تو تمہارے لئے مجسم راحت ورحمت ہی ہے۔ اس نبی صلعم محترم نے صدق کی راہیں نہ صرف دکھائیں بلکہ عمل بھی کر کے دکھا دیا۔

سچ بولنے کا انجام بھی نیک ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنے کی عادت اور اس کا انجام اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی رحمتؐ نے ارشاد فرمایا بے شک سچ انسان کو نیکوکاری کا راستہ بتلاتا ہے۔ اور نیکوکاری یقیناً انسان کو جنت میں پہنچا دیتی ہے۔ اور بے شک آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ جل شانہ کے ہاں اس کا نام صدیقین میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جھوٹ انسان کو بدکاری کا راستہ بتلاتا ہے اور بدکاری یقیناً انسان کو جہنم میں پہنچا دیتی ہے اور بے شک آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ جل شانہ کے ہاں اس کا نام کذابین، بڑے جھوٹوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔

اس حدیث نے صدیق سچ بولنے کے اس فائدہ کو واضح کیا ہے اور یہ بھی بتایا کہ قول اور فعل میں سچائی اختیار کرنے اور عادت ڈالنے کا ثمرہ ہی ہے کہ انسان صادقین کے درجہ سے ترقی کر کے صدیقین کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے جس کا مقام اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ہاں انبیاء کرام علیھم السلام کے بعد ہے جھوٹ اور اس کی عادت کا اندازہ کیجئے کہ جھوٹ کی جرات پیدا ہو جانے کے بعد بے شمار گناہوں اور جرموں کی راہ ہموار ہو جاتی ہے انسان بڑے سے بڑے گناہ اور جرم کا ارتکاب کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ یا شرم محسوس نہیں کرتا محض اس بنیاد پر کہ اگر بات کھلی تو میں صاف انکار کر دوں گا، نتیجہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار اور رسوا ہوتا ہے۔ اپنے کیے کی سزا بھگتا ہے اور آخرت میں تو جہنم کا عذاب اس کے لئے ہے ہی۔ اسی لئے اللہ جل شانہ کے ہاں اس کا مقام کذابین میں لکھ دیا جاتا ہے اور اس کا مقام جہنم کا سب سے نچلا طبقہ منافقین کا خاص مقام ہے۔ اس لئے تو سرکار دو عالمؐ نے منافق کی علامت بتائی ہے۔

جب بھی بات کرے جھوٹ بولے اور جب بھی وعدہ کرے اس کے خلاف کرے۔ اور جب بھی کسی سے عہد کرے تو عہد شکنی کرے۔ پہلی صفت صدق فی القول کے منافی اور کذب فی القول ہے دوسری اور تیسری صفت صدق فی الفعل کی ضد اور کذب فی الفعل ہے۔

اسی لئے تو قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں۔ حضرت حسن بن علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ مجھے اپنے نانا خاتم الانبیاء کی ایک قیمتی

نصیحت خوب اچھی طرح یاد ہے۔آپؐ نے ارشاد فرمایا: جس بات میں شک یا تردد ہواس کو چھوڑ دو اور جس میں کوئی شک وشبہ یا تردد نہ ہواس کو اختیار کرو تا کہ جھوٹا بننے کا امکان نہ رہے۔اس لئے کہ سچ قلبی اطمینان کا نام ہے اور جھوٹ بے اطمینانی اور تردد کا۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلعم نے سچ کی نہایت اہم پہچان بتلائی ہے کہ اطمینان قلب حاصل ہونا۔اس کو سچ سمجھو اور جس پر دل مطمئن نہ ہواس کو سچ مت سمجھو بسا اوقات کوئی بات بظاہر جھوٹی نہیں معلوم ہوتی مگر دل اس پر ٹکتا نہیں تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس بات کو باور بھی نہ کرو اور جھٹلاؤ بھی مت۔وقت گزرنے پر پتہ چل جاتا ہے۔

مومن کا دل

خاص کر ایک مومن کامل کے قلب کے متعلق تو سرکار دو عالم کا ارشاد ہے:
''ایک مومن کی فراست قلبی سے ہوشیار رہو۔اس لئے کہ وہ اللہ جل شانہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

اسوہ رسول اور صدق سرور کائنات صدق کی بہترین عملی تصویر تھے۔آپؐ کی زبان مبارک صدق کی امین ، قلب اطہر صدق کا مرکز اور عمل پیہم صدق کی پہچان تھا۔آپؐ کے صدق کے معترف آپؐ کے بدترین دشمن بھی تھے۔آپؐ صادق و امین کے القاب سے مشہور تھے حضور کے بدترین دشمن ابوجہل نے ایک بار کہا تھا:

''محمدؐ میں تجھے جھوٹا نہیں سمجھتا لیکن تیری تعلیم پر میرا دل نہیں ٹھہرتا۔ حضورؐ نے لوگوں کو تبلیغ اسلام کے لئے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر جب یہ فرمایا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے سے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم مان جاؤ گے۔تمام لوگوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا تھا کیوں نہیں۔ ہم نے آپ صلعم ہمیشہ سچ بولتے پایا ہے۔

صحابہؓ اور صدق

صحابہ کرام صدق کی عمدہ تصویر تھے۔صحابہؓ نے کائنات کے سب سے بڑے سچ یعنی اللہ کا اقرار کیا۔پھر تمام عمر اس سچ پر قائم رہے۔انہیں اس صدق کی صداقت کا اقرار کرنے پر ہر قسم کے مصائب برداشت کرنا پڑے۔لیکن انہوں نے اللہ کی صداقت پر صدق دل سے ایمان کا ثبوت اپنے عمل کی صداقت سے دیا۔پھر اس صداقت کی تصدیق کے لئے اپنی جانیں نچھاور کر دیں اور شہیدوں کی صفِ اول کے شخص ٹھہرے۔

مومن اور صدق

دور جاہلیت کے عربوں میں بے شمار برائیاں پائی جاتی تھیں لیکن وہ بے شمار خوبیوں کے مالک بھی تھے۔ان خوبیوں میں سے ایک صدق یعنی سچ بولنے اور سچ کا ساتھ دینے کی صفت بھی تھی۔آج ہم اپنے مسلمان اور مہذب ہونے کے دعویٰ کے باوجود صدق جیسی صفت سے بے نیاز ہیں۔نہ ہمارے اندر سچ برداشت کرنے کی قوت ہے نہ سچ کہنے کی اور نہ سچ کا ساتھ دینے کی جبکہ مومن اور صدق لازم وملزم ہیں۔

ارشاد نبویؐ ہے''مومن بزدل و بخیل ہوسکتا ہے مگر جھوٹا نہیں۔''

صدق انسان میں خود اعتمادی کو فروغ دیتا ہے جو انسان سچ پر قائم رہنے والا ہو وہ بڑی سے بڑی مصیبت اور نقصان کو سچ کے سامنے حقیر سمجھتا ہے اور جب انسان نفع ونقصان اور مصیبت وراحت کے پیمانوں سے آزاد ہو جائے تو وہ خود اعتمادی کی منزلیں طے کرنا شروع کر دیتا ہے۔صدق باہمی اعتماد میں اضافہ کرتا ہے اگر انسان سچ کا عادی ہو تو وہ کڑوا ہونے کے باوجود دوسروں کی نظر میں معتبر ضرور ہوتا ہے۔یہی اعتبار باہمی اعتماد کو پروان چڑھاتا ہے۔

سچ کا ساتھی چونکہ خود سچ کا قائل ہوتا ہے اس لئے کہ اسے سچ کڑوا نہیں لگتا وہ بڑی فراخ دلی سے حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔یہ چیز قوت برداشت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔عزت اور وقار میں اضافہ صدق کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔سچا ہونے کی وجہ سے لوگ اس کے ہر لفظ کو معتبر سمجھتے ہیں۔ یہ وہ عظمت ہے جو صرف صدیقین ہی کے حصہ میں آسکتی ہے۔

جب انسان سچ بولتا ہے تو اس کے قلب و ذہن اطمینان پاتے ہیں۔وہ حقیقت پرست ہو جاتا ہے۔حقیقت پر نظر رکھتا ہے اور حقیقت کا ہی ساتھ دیتا

ہے اس طرح اس کی ذات کا دائرہ ایک ہی رہتا ہے۔ اس کے اعضاء تضاد کا شکار نہیں ہوتے اور یہی چیز اطمینان کا باعث بنتی ہے۔

سچ پر قائم رہنے والا نفاق، بزدلی، حرص، خوف اور بے اعتمادی جیسی بے شمار برائیوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور اخلاق حسنہ کا مجموعہ بنتا چلا جاتا ہے۔ جو شخص سچ پر قائم رہنے والا ہو۔ اس میں مسائل کو سمجھنے حل کرنے اور قوت طلب مراحل سے گزرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ صدق قائدانہ صلاحیتوں اور رہنمایانہ کردار کے لئے ضروری ہے گویا کہ

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا کام تجھ سے دنیا کی امامت کا۔

اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ حضرت ابوسفیانؓ اسلام لانے سے پہلے زمانہ میں رومی بادشاہ ہرقل سے رسول اللہ صلعم کے بارے میں اپنی ملاقات اور گفتگو کا ایک قصہ حدیث میں بیان کرتے ہیں کہ ہرقل نے ابوسفیان سے دریافت کیا کہ تمہیں وہ نبی کس بات کا حکم دیتا ہے ابوسفیان کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا وہ نبی کہتا ہے صرف اللہ جل شانہ کی عبادت کرو اور کسی بھی چیز کو اس کا شریک مت گردانو اور تمہارے باپ دادا جو کہتے چلے آئے ہیں۔ ان سب کو بالکل چھوڑ دو اور نبی ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دیتا ہے اور سچ بولنے کا پاک دامنی اختیار کرنے کا اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

صدق درحقیقت انبیاء کرام کی صفات عالیہ میں سے ہے اور تمام انبیاء سابقین کی تعلیمات میں صدق کو ایک متفق علیہ مسلم اور مانی ہوئی فضیلت کا مقام حاصل ہے۔ روسی بادشاہ ہرقل اس حقیقت کو جانتا تھا۔ وہ آپؐ کے امر بالصدق، سچ بولنے کے حکم کو آپ کے نبی برحق ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے نہ صرف انبیاء کرام علیہ السلام بلکہ دنیا کے تمام حکماء اور علماء اخلاق بھی صدق کو انسانی کمالات وفضائل میں سرفہرست اوّل عزیز شمار کرتے ہیں۔ سچے دل سے کسی بات کے کہنے یا دعا مانگنے کا اجر اس حدیث میں اس کی فضیلت کا ذکر بیان کیا گیا ہے:

حضرت ابوثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ جل جلالہ سے صدق دل سے شہادت کے درجہ کی دعا مانگتا ہے اللہ جل شانہ اس کو شہیدوں کے مرتبہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ اگرچہ بستر پر پڑ کر اس کو موت آئے۔ یہ صدق فعلی ہے جس کو اردو میں سچے دل سے مانگنا یا کسی سے وعدہ کرنا کہتے ہیں جس کا دوسرا نام اخلاص ہے۔ دیکھیے اللہ جل شانہ کے ہاں اس کی کتنی قدر ہے کہ لڑائی کے میدان میں شہید ہوئے بغیر ہی محض صدق واخلاص کی بنا پر اتنا بلند مرتبہ عطا فرما دیتے ہیں۔

فرقان حمید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتوں اُن سب کے لئے بڑا بدلہ اور ثواب تیار کر رکھا ہے۔''

قرآن مجید میں نبیوں کی سچائی کا ذکر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت ادریسؑ کے متعلق فرماتے ہیں:

''اور ذکر کرو کتاب میں حضرت ادریسؑ کا کہ وہ سچے نبی تھے۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ فرمایا ''اور ان کی ماں سچی تھی۔

حضرت یوسفؑ کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔ ''یوسف اے سچے یوسف''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے اللہ سبحانہ فرماتے ہیں اور ذکر کرو کتاب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کہ وہ سچے نبی تھے۔

جھوٹ تمام برائیوں کی ماں ہے

ایک دفعہ ایک شخص رسول خدا کی طرف خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ مجھ میں چند برائیاں ہیں۔ ان برائیوں میں سے آپ کے کہنے پر میں ایک برائی چھوڑ دیتا ہوں۔ نبی پاک صلعم نے فرمایا جھوٹ چھوڑ دو۔ دوسرے دن اس آدمی نے حاضری دیتے ہوئے کہا۔ جھوٹ چھوڑنے سے میری تمام برائیاں جاتی رہی ہیں کیونکہ جب بھی میرے دل میں برائی کا خیال آتا تو میں سوچتا کہ آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا اور اگر نہ چھپایا تو سزا سے کیسے بچوں گا۔

تم صدق کو لازم پکڑو۔ اور ہمیشہ سچ بولو، کیونکہ صداقت نیکی ہے اور نیکی جنت کی ضامن ہے۔

صدق بھلائیوں کے حصول کا ضامن

اعلیٰ اخلاق انسان میں صدق سے ہی آتے ہیں۔ برائیاں کبھی بھی سچے آدمی کے پاس نہیں آسکتیں۔ ہر انسان سچ بولنے والے کو دل سے چاہتا ہے۔ سچا آدمی اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے وہ کبھی بھی غم زدہ پریشان نہیں ہوتا۔ سب پریشانیاں جھوٹ کے لئے ہیں۔ جھوٹ بولنے والے شخص کے رزق میں کمی ہوجاتی ہے۔ اللہ برکت کھینچ لیتا ہے۔ صدق سے عمل کی دنیا میں وسعت ہوتی ہے۔ صدق سے ہی اعلیٰ کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ آدمی کی شخصیت میں نکھار سچ سے ہی آتا ہے۔ جھوٹا آدمی تو منافق کہلاتا ہے منافق کبھی بھی اعلیٰ کردار کا نہیں ہوسکتا۔ صدق سے دل کی صفائی ہوتی ہے، نفاق بھاگ جاتا ہے اور انسان متقی پرہیزگار بن جاتا ہے۔

حضرت ابوخالد حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قاعدہ مقرر فرمایا ہے کہ بیچنے والا خریدنے والا، دونوں کو، خریدنے نہ خریدنے کا اختیار رہتا ہے جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں، پس اگر ان دونوں نے سچ بولا اور مال کے عیب دار یا عیب کو ظاہر کردیا اور بتلا دیا کہ یہ مال ایسا ہے تو ان کے اس سودے میں دونوں کے لئے برکت عطا فرما دی جائے گی اور اگر عیب کو چھپایا اور جھوٹ بولا تو ان دونوں کے سودے کی برکت مٹا دی جائے گی۔

جھوٹ بولنا گناہ در گناہ ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیوی معاملات میں جس طرح دینی امور میں سچ بولنا ضروری ہے اسی طرح دنیوی امور اور معاملات میں بھی سچ بولنا ضروری ہے بلکہ دنیوی امور اور معاملات میں لین دین میں خرید و فروخت میں۔ جھوٹ تو صرف جھوٹ ہی نہیں بلکہ دھوکہ دہی اور ضرر رسائی بھی ہے اور حقوق اللہ سے متعلق نہیں کہ توبہ و استغفار سے معاف ہوجائے بلکہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے جب تک متعلقہ شخص یا اشخاص کا حق ادا نہ کیا جائے اور نقصان کی تلافی نہ کی جائے یا معاف نہ کرایا جائے اس وقت تک اس کی سزا سے بچنا ممکن نہیں۔

ہمارے موجودہ معاشرے میں ویسے تو تمام ہی دنیاوی امور خصوصاً لین دین۔ خرید و فروخت وغیرہ سرتاسر جھوٹ دھوکے وار فریب پر چل رہے ہیں مگر بدقسمتی سے لوگ روزہ نماز کے پابند ہیں اور دیانتدار اور پرہیزگار کہلاتے ہیں وہ بھی ان معاملات میں جھوٹ بولنے کو جھوٹ ہی نہیں سمجھتے۔ چیز دوکان پر ہوگی اور کہہ دیتے ہیں کہ نہیں ہے نقلی چیز ہوگی بلا تکلف اس کو اصلی بنا دیں گے۔

اس حدیث میں ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور عہد کر لینا چاہیے کہ کسی بھی معاملہ میں کسی بھی صورت میں جھوٹ ہرگز نہ بولیں گے چاہے سچ بولنے میں کتنا ہی نقصان ہو، دشواریاں پیش آئیں، نقصان اٹھانے پڑیں، ناراضگیاں مول لینی پڑیں اگر ہم صدق دل سے یہ عہد کریں گے اور اس مقام پر قائم رہیں گے تو اللہ جل شانہ ہماری ضرور مدد فرمائے گا۔

وفات حسرت آیات

''ہم اللہ ہی کی طرف سے ہیں اور اسی کی جانب لوٹ کر جانے والے ہیں''

ہم سب کے لئے انتہائی دُکھ کی بات ہے کہ دوران سال ماہ نومبر میں درج ذیل احباب اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔

جماعت کا ہر فرد ان احباب کی کمی محسوس کرتا اور ان کے اہل خانہ کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

اللہ رب العزت مرحومین کی نیکیوں کو قبول و منظور فرماتے ہوئے کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں بلند اور اعلیٰ مقامات میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

(۱): محمد عاصم (گارڈ امیر قوم) کی ساس صاحبہ (لاہور)

(۲): عبدالمالک صاحب کی زوجہ محترمہ (پشاور)

(۳): ڈاکٹر مبارک احمد مرحوم کے داماد (لاہور)

مدثر عزیز (مدیر) پیغام صلح انٹرنیشنل نے دفتر 8-7 برنیئر سٹریٹ 10713 برلن (جرمنی) سے شائع کیا

حضرت مسیح موعود کا عقیدہ

اور ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلعم اس کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور ہم ایمان لاتے ہیں کہ ملائک حق اور حشر اجساد حق اور روزِ حساب اور جنت حق اور جہنم حق ہے۔ اور ہم ایمان لاتے ہیں کہ جو کچھ اللہ جل شانہ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے اور جو کچھ ہمارے نبی صلعم نے بیان فرمایا ہے وہ سب بلحاظ بیان مذکورہ بالا حق ہے اور ہم ایمان لاتے ہیں کہ جو شخص اس شریعت اسلام میں ایک ذرہ کم کرے یا ایک ذرہ زیادہ کرے یا ترک فرائض اور اباحت کی بنیاد ڈالے وہ بے ایمان اور اسلام سے برگشتہ ہے اور ہم اپنی جماعت کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ سچے دل سے اس کلمہ طیبہ پر ایمان رکھیں کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور اسی پر مریں اور تمام انبیاء اور تمام کتابیں جن کی سچائی قرآن شریف سے ثابت ہے ان سب پر ایمان لاویں اور صوم اور صلوٰۃ اور زکوٰۃ اور حج اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ تمام فرائض کو فرائض سمجھ کر اور تمام منہیات کو منہیات سمجھ کر ٹھیک ٹھیک اسلام پر کاربند ہوں غرض وہ تمام امور جن پر سلف صالح کو اعتقادی اور عملی طور پر اجماع تھا اور وہ امور جو اہل سنت کی اجماعی رائے سے اسلام کہلاتے ہیں ان سب کا ماننا فرض ہے اور ہم آسمان اور زمین کو اس بات پر گواہ کرتے ہیں کہ یہی ہمارا مذہب ہے اور جو شخص مخالف اس مذہب کے کوئی اور الزام ہم پر لگاتا ہے وہ تقویٰ اور دیانت کو چھوڑ کر ہم پر افترا کرتا ہے اور قیامت میں ہمارا اس پر یہ دعویٰ ہے کہ کب اس نے ہمارا سینہ چاک کر کے دیکھا کہ ہم باوجود ہمارے اس قول کے دل سے ان اقوال کے مخالف ہیں۔ الا لعنة اللّٰہ علی الکاذبین المفترین

(ایام الصلح ص ۸۶-۸۷)